چند

تنقیداتِ عبدالحق

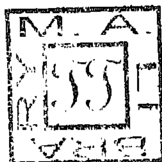
یعنے

اُردو کے محسنِ اعظم مولانا عبدالحق پروفیسر اُردو جامعۂ عثمانیہ
و معتمد انجمن ترقّیٔ اُردو (ہند) کی چند اہم تنقیدات کا مجموعہ

شایع کردہ

انجمن ترقّیٔ اُردو (ہند) دہلی

سنہ ۱۹۳۹ء



بار اوّل قیمت ۸/

فہرست مضامین

نمبر شمار	مضمون	صفحہ
۱	سرگزشتِ الفاظ	۱
۲	زبان اُردُو پر سرسری نظر	۶
۳	مکاتیبِ امیر مینائی	۱۳
۴	اصلاحِ سخن	۲۰
۵	اُردُو شہ پارے	۲۶
۶	اکبر الہ آبادی	۳۲
۷	فیضانِ شوق	۳۷
۸	اُردُو لٹریچر	۵۵
۹	نورُاللّغات	۶۸
۱۰	مجموعۂ نغز	۷۴

خانصاحب عبداللطیف نے لطیفی پریس دہلی میں چھاپا

اور

مینجر انجمن ترقی اردو (ہند) نے دہلی سے شائع کیا



سرگزشت الفاظ

اس کتاب کے مؤلف مولوی احمدالدین صاحب بی۔اے وکیل لاہور ہیں - الفاظ بھی ایک طرح انسان کی طرح جاندار ہیں وہ بھی انسان کی طرح پیدا ہوتے مرتے، بڑھتے اور گھٹتے ہیں - ہر لفظ اپنے ساتھ ایک تاریخ رکھتا ہے جو خود اس کی ذات میں پنہاں ہے - وہ گزشتہ زمانہ کی تہذیب اور معاشرت کی یادگار ہے وہ قومی ترقی کے ساتھ ترقی کرتا اور قومی تنزل کے ساتھ تنزل کرتا ہے - یہ بھی انقلاب زمانہ سے انسان کی طرح کبھی ادنیٰ سے اعلیٰ اور اعلیٰ سے ادنیٰ، شریف سے رذیل اور رذیل سے شریف ہو جاتا ہے - لیکن ہر لفظ زبان میں ایک منصب رکھتا ہے اور اس کے صحیح استعمال پر وہی قادر ہو سکتا ہے جو اس کی سیرت سے آگاہ ہے یہ انشا پردازی کا بڑا گر ہے - قابل مؤلف نے لفظ کے ہر پہلو پر نظر ڈالی ہے اور تحقیق کی داد دی ہے اور ساتھ ساتھ مثالیں دے کر اپنے دعوے کو ثابت کرنے کی کوشش کی ہے - یہ موضوع بہت دلچسپ مگر ساتھ ہی بہت مشکل اور محنت طلب ہے اور اسی لیے اس میں کہیں کہیں لغزش یا کوتاہی کا ہو جانا لازم ہے مثلاً ایک جگہ فرماتے ہیں کہ میز کی اصلیت کا

پتہ لگانا سہل نہیں۔ تحقیق سے یہ معلوم ہوا ہے کہ یہ لفظ پرتگالی ہے۔ پرتگالی زبان میں اسے اس طرح لکھتے ہیں (Mesor) ایک دوسری جگہ لکھتے ہیں کہ "اسلامی دنیا میں صلواۃ کا تقدس اور احترام مسلمہ ہے اور ایک مسلمان کی زبان پر اس کی عظمت و شان روز روشن کی طرح عیاں ہے لیکن قوم کی سبکسری، خفت عقل اور ضعف ایمان کا اس سے بڑھ کر اور کیا ثبوت ہو سکتا ہے کہ اس قابل تحریم و مقدس لفظ کو جمع کی صورت میں ایک ذلیل حرکت انسانی کے ساتھ وابستہ کردیا ہے۔ کہاں صلواۃ اور کہاں صلواتیں" یہ صحیح ہے لیکن اگر وہ صلواۃ کے لغوی معنوں کی تحقیق کرتے تو انھیں معلوم ہو جاتا کہ یہ لفظ کس طرح ادنیٰ سے اعلیٰ ہو گیا اور پھر اُردو میں جمع کی صورت میں کن ذلیل معنوں میں استعمال ہونے لگا۔ یہی تو زمانے کے اُتار چڑھاؤ ہیں۔ ایک جگہ چھوئی موئی کے متعلق لکھا ہے کہ "چھُوا تو موئی بدن خشک، پژمردگی طاری اور بس" بدن خشک کبھی نہیں ہوتا بلکہ چھونے سے بدن سُکیڑ لیتی ہے۔ مشعلچی کو لکھتے ہیں کہ اردو میں آکر باورچی خانے میں برتن صاف کرنے کی صفت کے لیے مخصوص ہو گیا۔ ابھی تک تو یہ صحیح نہیں معلوم ہوتا ممکن ہے آیندہ یہی ہو جائے۔ اٹکل کے متعلق لکھا ہے کہ "اگرچہ ابتدا میں قیاس اور رائے قائم کرنا ہی تھا لیکن اب قیاس اور رائے کی وقعت اٹکل پچّو کی ترکیب میں ظاہر ہوتی معلوم ہوتی ہے اٹکل اب بھی قیاس اور اندازے ہی کے

معنوں میں مستعمل ہی ایک دوسرے مقام پر لکھتے ہیں کہ "مدرسہ، تعلیم گاہ اور مکتب سے یقیناً اعلیٰ رتبہ کی چیز ہی" ہمارے خیال میں یہ صحیح نہیں معلوم ہوتا کہ مدرسہ تعلیم گاہ سے ہر حالت میں اعلیٰ درجہ کی چیز ہی۔

"جُلاب، انگریزی میں جیلپ، مکسیکو کے ایک شہر جلاپا کے نام سے ہی"، قابل مؤلف نے یہ نئی بات لکھی ہی جو درست نہیں معلوم ہوتی۔ ہماری تحقیق میں یہ لفظ گلاب کا معرّب ہی۔ کراہت سے بچنے کے لیے مسہل کے لیے استعمال ہونے لگا ہی۔" رضائی محمد رضا موجد کے نام پر ہی" جہاں تک ہمارا خیال ہی یہ لفظ دراصل رزائی ہی چونکہ یہ عموماً رنگے ہوئے کپڑے کی بنائی جاتی ہی اس لیے یہ نام پڑ گیا۔

پاکھنڈ کے لغوی معنی مؤلف نے وید کے برخلاف بدعت بیان کیے ہیں اور اصطلاحی معنی، وہ عبارت جو دکھاوے کی ہو۔ حرام زدگی، بدذاتی، شرارت۔ لیکن لفظ کی تحقیق سے گریز کیا ہی۔ پاکھنڈ مرکب ہی پا اور کھنڈ سے۔ پا کے معنی پالنے والے یا حفاظت کرنے والے کے ہیں جس سے مراد دھرم لی جاتی ہی۔ کھنڈ کے معنی منتشر کرنے اور توڑنے کے ہیں۔

بعض الفاظ پردہ پوش ہوتے ہیں۔ یعنی کسی مکروہ یا ناگوار شی یا خیال کو اچھے اور خوشنما الفاظ میں ادا کرتے ہیں مؤلف نے متوالا کے لفظ کو بھی انھیں میں شمار کیا ہی۔ وہ اسے مت (سمجھ۔ عقل) اور والا سے مرکب سمجھے ہیں حالانکہ یہ لفظ مد اور والا سے مرکب ہی۔ مد کے معنی

ہندی اور سنسکرت میں عرق، شراب اور مستی کے ہیں۔کثرت استعمال سے ق، ت، سے بدل گئی ہے۔ان دو حرفوں کا بدل باہم ہوتا ہے۔

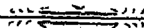
اسامی کے ایک معنی امیر کے بھی لکھے ہیں۔ درحقیقت یہ امیر کے معنوں میں نہیں آتا بلکہ بعض اوقات مالدار سے مراد ہوتی ہے مگر اس میں ہمیشہ ذم کا پہلو ہوتا ہے۔

مؤلف نے منجملہ اور بحثوں کے غیر مستعمل الفاظ کی طرف بھی توجہ فرمائی ہے جو کتابی خزانوں میں بند اور بیکار پڑے ہیں اور جن سے ہم ناواقفیت یا کم فہمی کی وجہ سے کام نہیں لیتے۔ ہمیں اس خیال سے بالکل اتفاق ہے۔ درحقیقت ایسے الفاظ اچھی خاصی تعداد میں موجود ہیں جن کا استعمال اب نہیں رہا یا جو ٹکسالی نہیں سمجھے جاتے حالانکہ وہ بعض خیالات کے ادا کرنے میں بہت کام آسکتے ہیں۔افسوس ہے کہ قابل مؤلف نے اس بحث کو مختصر طور سے چند سطروں میں بیان کر دیا ہے۔ یہ چنداں قابل شکایت نہیں کیونکہ اس مختصر کتاب میں ہر بحث تفصیل سے بیان نہیں ہوسکتی تھی۔لیکن شکایت اس کی ہے کہ انھوں نے مثال کے طور پر ایک لفظ بھی تو ایسا نہیں لکھا جو اُن کی رائے میں رواج دینے کے قابل ہے اگر وہ چند مثالیں بھی لکھ دیتے تو ناظرین کو مؤلف کے مطلب کے سمجھنے میں بہت آسانی ہوتی۔

بہرحال یہ ایسی باتیں ہیں جن پر نظرثانی کی ضرورت ہے الفاظ کی

تحقیق میں اکثر غلطی ہوجاتی ہی اور اس سے کتاب کی قدر و قیمت کم نہیں ہوسکتی - قابل مؤلف نے انگریزی زبان کی مشہور کتاب ریورنڈ ٹرینچ کی تالیف (Study of Words) کو پیش نظر رکھا ہی بلکہ اس کا چربہ اُتارا ہی- ترتیب بھی وہی ہی اور انداز بیان بھی قریب قریب اسی طرح کا ہی البتہ جہاں اصل کتاب میں انگریزی، فرانسیسی، لاطینی لفظ تھے، مولف نے ان کی جگہ سلیقہ سے اردو، ہندی، فارسی، عربی الفاظ داخل کردیے ہیں انداز بیان میں کسی قدر مولانا آزاد مرحوم کا بھی تتبع کیا ہی اور کہیں کہیں ان کی تصانیف سے بھی مدد لی ہی اور یہ کتاب بھی مرحوم ہی کے نام سے معنون کی ہی- لائق مؤلف کی محنت قابل داد ہی- یہ کتاب طلبہ اور عام شایقین کے لیے بہت کارآمد ہی اس سے اُن کے دلوں میں الفاظ کی تحقیق، لغوی، معروف اور اصطلاحی معنوں کے فرق، حالاتِ زمانہ کے اثر سے معنوں میں تغیر و تبدل اور لفظوں کی اصل دریافت کرنے کا شوق پیدا ہوگا اور یہ ادب کی تحصیل میں بہت کچھ مدد دیتا ہی- خوشی کی بات ہی کہ پنجاب گورنمنٹ نے ازراہ قدردانی مؤلف کو انعام عطا فرمایا ہی اور وہ اس کے مستحق تھے-

مولوی احمد دین صاحب بی، اے وکیل لاہور سے مل سکتی ہی- چھوٹی تقطیع تعداد صفحات (۳۰۴) قیمت دو روپے- چھپی بھی اچھی ہی-



زبانِ اُردو پر سرسری نظر

یہ اُن شبانہ لکچروں میں سے ہی جو آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس علی گڑھ کے گزشتہ اجلاس میں پڑھے گئے تھے۔ اس اجلاس کا یہ خاص امتیاز تھا کہ بہت سے قابل اور فاضل حضرات کو دعوت دی گئی تھی کہ وہ کانفرنس میں علمی اور تعلیمی مسائل پر تقریریں فرمائیں اور جناب صاحبزادہ آفتاب احمد خاں صاحب قابل شکریہ ہیں کہ ان کی بدولت کانفرنس کے اس اجلاس میں اچھی خاصی رونق ہوگئی اور علمی چرچا پیدا ہوگیا۔ جناب رشید احمد صاحب صدیقی اُردو لکچرار مسلم یونیورسٹی نے اردو زبان پر ایک مضمون پڑھا تھا جو اب کسی قدر اضافہ کے ساتھ کتاب کی صورت میں شایع ہوا ہی۔

اس مقالے میں قابل لکچرار نے اُردو کی تاریخ سے زیادہ بحث نہیں کی اور نہ اس کی ضرورت تھی بلکہ اردو کی موجودہ روش اور آیندہ ترقی کی تدابیر پر بہت دلچسپ بحث فرمائی ہی جس میں مختلف مسائل آگئے ہیں جن میں اختلاف اور بحث کی بہت گنجایش ہی۔ صدیقی صاحب نے اُردو کے جدید دور کو غالب سے شروع کیا ہی اور اس نامور شاعر کو جو اپنا مثل اُردو ہی میں نہیں بلکہ بہت سی زبانوں میں نہیں رکھتا

چند ہی سطروں میں ختم کردیا ہے اور مرزا صاحب کی شاعری پر جو نقادانہ رائے انھوں نے فرمائی ہے وہ قابل سننے کے ہے- وہ فرماتے ہیں کہ "غالب کی شاعری ایک حد تک صرف ہائے و ہو اور نا ؤ نوش کی ترجمان ہے"

یہ رائے ایک ایسے شخص کے قلم سے نکلی ہے جس نے اُردو ادب کا بغور مطالعہ کیا ہے، خود بھی ادیب ہے اور یونیورسٹی میں اردو کا لکچرار ہے- اور اس لیے نہایت حیرت انگیز ہے- ناپسندیدگی کی ایک وجہ یہ بھی معلوم ہوتی ہے کہ مرزا کی شاعری میں "کوئی پیغام (Message) نہیں ملتا "- کیا شکسپیر کی شاعری میں جو سرتاج شعرائے عالم ہے، کوئی "پیغام" ملتا ہے؟ ایک نہیں، کئی کئی- یہی حال مرزا کی شاعری کا ہے- کیا یہ کچھ کم ہے کہ مرزا غالب نے اُردو شاعری کو پستی سے نکال کر کہیں کا کہیں پہنچا دیا- غزل میں عام روش اور تقلید سے آزاد ہو کر نیا رنگ پیدا کیا (لیکن شاید صدیقی صاحب غزل میں کسی اصلاح کے قائل نہیں) خیالات کی جدّت، تخیّل کی بلندی اور بیان کا لُطف جو مرزا غالب کے ہاں پایا جاتا ہے وہ اُردو کے کسی شاعر میں نظر نہیں آتا- میں ایسے کئی صاحبوں کو جانتا ہوں جنھیں مرزا کے مختصر دیوان میں وہ پیغام ملے ہیں جو کسی دوسرے کلام میں کیا مذہب و اخلاق کی کتابوں میں بھی نہیں ملے اور اُن پر مرزا کے کلام کا خاص اثر ہوا ہے (میری ذاتی رائے

یہ ہے کہ اگر مرزا غالب نہ ہوتے تو حالی اور اقبال بھی نہ ہوتے - مرزا غالب کا اثر اُردو شاعری پر عجیب و غریب ہؤا ہے اور رہے گا) کیا بغیر کسی پیغام کے یہ ممکن ہے؟ صدیقی صاحب اس بات سے بھی ناراض ہیں کہ مرزا صاحب کا قدیم کلام کیوں چھاپا گیا (شاید وہ اسے مہمل سمجھتے ہیں) فرماتے ہیں کہ "میرا خیال ہے کہ اردو نوازی کے اس سے بہتر طریقے بھی ممکنات سے تھے"۔ یہ خیال اُردو کے ایک پروفیسر کا ہو؛ حیرت سے خالی نہیں! غالباً انھوں نے اس کلام کا مطالعہ نہیں فرمایا ورنہ انھیں معلوم ہوتا کہ جن ظالموں کے ہاتھ میں مرزا کے کلام کا انتخاب تھا، اُنھوں نے بیدردی سے ایسے ایسے اشعار مجروح کر دیے جن کی نظیر سوائے مرزا کے کلام کے کہیں نہیں ملتی - علاوہ اس کے اس کلام سے اس زبردست اور بلند خیال شاعر کی طبیعت اور اس کے کلام کے ارتقا کی صحیح حالت کا اندازہ ہوتا ہے جس کا جاننا ایک پروفیسر اور محقق کے لیے نہایت ضروری ہے- ممکن ہے کہ صدیقی صاحب ان امور کو "واقعات کی کھتونی" سمجھیں لیکن اس کے جانے بغیر محقق ہونا ممکن نہیں - صدیقی صاحب کے اس طعن آمیز اعتراض (اردو نوازی) کو دیکھ کر جس کی تلخی پس سے کم نہیں مجھے معًا ایک دوست کا خیال آیا جنھوں نے ایک بار بڑی متانت سے یہ فرمایا کہ آپ جو شعرا کے تذکرے اور شعرا کا کلام چھاپتے ہیں اس سے کیا حاصل ہے؟ کہیں

بہتر ہوتا کہ انجن، صابون سازی اور دباغت پر کتابیں لکھوا کر چھاپتی۔ میں اعتراف کرتا ہوں کہ مجھے لاجواب ہونا پڑا۔ اور یہی کیفیت میں آج پھر محسوس کرتا ہوں۔

اس کے بعد قابل لکچرار نے حالی کا ذکر فرمایا ہی اور شکوۂ ہند کے چند شعر لکھ کر یہ رائے دی ہی کہ "چونکہ اُن کی ہر تان ماضی پر ٹوٹتی ہی اس لیے حالی کو بجا طور پر ماضی کا شاعر کہنا چاہیے۔" لیکن اسی جملے کے پہلے حصہ میں فرماتے ہیں کہ حالی نے اپنے زمانے کی صحیح مصوری کی ہی اور ان معنوں میں اُن کا شمار حقیقی شعرا میں ہو سکتا ہی۔" بظاہر ان دونوں جملوں میں تضاد معلوم ہوتا ہی لیکن جو مطلب ہی وہ ظاہر ہی۔ اپنے زمانے کی صحیح تصویر کھینچنے والا "ماضی" کیسے ہو سکتا ہی؟ اس میں شک نہیں کہ حال کو ماضی سے جدا نہیں کر سکتے اور ہر حال ماضی ہو جاتا ہی لیکن مولانا حالی مرحوم نے اپنے وقت کے حال پر اس کثرت سے لکھا ہی کہ وہ ان کو بجا طور پر حالی ہی کہنا موزوں ہوگا۔ پھر انسانی فطرت کے متعلق جو جو نکتے وہ لکھ گئے ہیں ان کا جواب اب تک ہماری شاعری میں نہیں ہی۔ البتہ شوخی اور تمسخر ان کے کلام میں نہیں اور نہ وہ وقت ان خوش فعلیوں کا تھا۔ کسی مصنف یا شاعر پر اس وقت تک صحیح رائے قائم نہیں ہو سکتی جب تک انسان اس کے پورے کلام کا مطالعہ نہ کر لے ورنہ ایسی رائیں ادھوری اور ناقص ہوں گی۔

حالی کے بعد اکبر کا ذکر آتا ہے اور بہت سے شعر نقل کرکے جن میں سے اکثر زبان زد عام ہیں اُن کی شوخی ظرافت اور حکیمانہ نکات کی تشریح کی ہے۔ ان اشعار کو صدیقی صاحب " لسان العصر کے الہامات" فرماتے ہیں۔ یہاں تک ماضی و حال کی ترجمانی تھی، اب مستقبل شاعر کا ذکر ہوتا ہے جس سے ان کا مطلب اقبال سے ہے۔ یہ بیان بہت طویل اور پُر زور ہے اور قابل لکچرار نے اپنی طبیعت کا سارا زور اس پر صرف کر دیا ہے۔ اقبال کی شاعری سے انکار کرنا کفر ہے اور نہ ہمیں اس سے چنداں اختلاف ہے جو صدیقی صاحب نے اس حقیقت شناس شاعر کی مداحی میں بیان کیا ہے لیکن عجیب بات یہ ہے کہ اقبال کا جس قدر کلام انھوں نے اپنے دعوے کے ثبوت میں پیش کیا ہے وہ سب کا سب فارسی ہے، اردو کا ایک شعر بھی کہیں نقل نہیں کیا حالانکہ بحث سراسر اُردو سے ہے۔

صدیقی صاحب مُردوں سے بہت بیباک ہیں لیکن زندوں سے ڈرتے ہیں۔ انھوں نے ہر زندہ انشا پرداز کی جو ذرا بھی شہرت رکھتا ہے یا مقبول ہے، خوب تعریف کی ہے اور اگر کہیں کسی کے متعلق ہلکا سا دبی زبان سے کوئی جملہ کہہ بھی دیا ہے تو جھٹ اُس کی پیٹھ بھی تھپک دی ہے تاکہ وہ چیں بجبیں نہ ہونے پائے۔ میں اس کی داد دیتا ہوں کہ کوئی نام ایسا نہیں چھوٹنے پایا جس سے ذرا بھی اندیشہ ہو سکتا ہے۔

اس کے بعد اُردو زبان اور اس کی ترقی کے متعلق مختلف مسائل پر بحث کی ہے مثلاً تاریخی پہلو، رسم الخط، فارسی عربی کا تعلق، اردو کے معلّم کی صفات، عامیانہ روش (جسے قابل لکچرار نے "جھانپلزم" سے موسوم کیا ہے)، انجمن اردوئے معلیٰ کانفرنس معلمین اردو، اکاڈمی، انسائیکلو پیڈیا، اُردو مکاتب، اردو گفتگو، ترجمہ، تالیف اور تصنیف، افسانہ نویسی، یہ بحثیں اگرچہ مختصر ہیں مگر بہت دلچسپ اور کام کی ہیں۔ انھیں پڑھ کر جی للچاتا ہے کہ کچھ نہ کچھ لکھا جائے، لیکن اس تبصرے میں اتنی گنجایش نہیں۔ صدیقی صاحب نے بعض ایسی باتیں سجھائی ہیں جو غور اور بحث کے قابل ہیں اور ان میں سے ہر عنوان پر علیحدہ لکھنے کی ضرورت ہے۔ اس لکچر کا ایک بڑا عملی فائدہ یہ ہوا کہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں انجمن اُردوئے مُعلّیٰ قائم ہوگئی۔ یہ بڑی مُبارک فال ہے اور ہمیں امید ہے کہ صدیقی صاحب کی پُرجوش نگرانی میں یہ پھولے پھلے گی۔ ارباب یونیورسٹی کو اِس پر خوش ہونا چاہیے اور اس کی امداد میں دریغ نہ کرنا چاہیے۔ یہ بھی تجویز ہے کہ اس انجمن کی سرپرستی میں ایک رسالہ اردوئے مُعلّیٰ کے نام سے جاری کیا جائے گا۔

صدیقی صاحب قابل شکریہ ہیں کہ اُنھوں نے اس لکچر کو شایع کرکے اُردو کے بہی خواہوں کو بعض ضروری امور کی طرف متوجہ کیا ہے۔ ان کے طرز بیان میں ایک بانکپن پایا جاتا ہے جس میں شوخی کی جھلک ضرور

ہوتی ہے۔ لیکن بعض اوقات لفّاظی کے اُلجھاؤ سے الجھن پیدا ہونے لگتی ہے۔ صدیقی صاحب اُردو کے اُن انشا پردازوں میں سے ہیں جن سے بڑی بڑی امیدیں ہیں۔ دیکھنا یہ ہے کہ طبیعت کی افتاد انھیں کدھر لے جاتی ہے۔ جس میں سنورنے کی صلاحیت ہوتی ہے۔ اسی میں بگڑنے کے لچھّن بھی ہوتے ہیں۔

یہ لکچر بڑی تقطیع کے ۵۲ صفحہ پر ہے۔ مسلم یونیورسٹی انسٹیٹیوٹ پریس علی گڑھ میں بہت خوش خط اور اچھا چھپا ہے۔ معلوم نہیں کس سے اور کتنے میں ملتا ہے۔ شائقین منیجر صاحب مطبع مذکور سے رجوع کریں۔

مکاتیبِ امیرمینائی

منشی مفتی امیراحمد صاحب مینائی مرحوم اس زمانے کے بہت اچھے اور مستند شعرا میں سے تھے۔ بعض کے نزدیک وہ متاخرین میں سب سے بہتر شاعر خیال کیے جاتے ہیں، مگر اس میں شک نہیں کہ وہ اخلاق و عادات میں اسلاف کا نمونہ اور شعر و شاعری میں قدما کی یادگار تھے۔ پہلی بات پر ان کے خطوط اور دوسری پر ان کی اِصلاح سخن شاہد ہے۔

منشی صاحب مرحوم کے رشید اور عزیز شاگرد مولوی احسن اللہ خان صاحب ثاقب (مدیر رسالۂ قند پارسی و پروفیسر وکٹوریہ کالج گوالیار) نے بڑی تلاش اور کوشش سے منشی صاحب مرحوم کے خطوط جمع کر کے پہلی بار سنہ ۱۹۱۰ء میں شایع کیے اور اب دوسری بار یہ مجموعہ اضافے اور ترمیم کے ساتھ شایع کیا گیا ہے۔

شروع میں حضرت امیر کے حالات، وضع و اخلاق و عادات اور تصانیف و تالیفات کا کسی قدر مفصل ذکر ہے۔ اس کے بعد چند خوش فکر تلامذہ کا ذکر اور ان کے کلام کی وقتاً فوقتاً جو اصلاح کی ہے اس کے نمونے دیے ہیں۔ بعض بعض مقامات پر مرحوم نے اِصلاح کی وجہ بھی بتا دی ہے۔ یہ اصلاحیں پُرلطف ہیں اور ان سے ایک حد تک بصیرت ہوتی ہے۔

یہ اصلاحیں صرف زبان کی حد تک ہوتی ہیں، نفس شاعری سے انھیں تعلق نہیں ہوتا۔ اسی دیباچہ میں انھوں نے امیر کے کلام پر تبصرہ کیا ہے جو بلاشبہ منصفانہ اور ایک حد تک بے لاگ ہے جس کی توقع ان کے کسی شاگرد سے نہیں ہوسکتی۔ اسی میں داغ و امیر پر بھی محاکمہ فرمایا ہے ان دونوں باکمال استادوں کی زندگی ہی میں دو جتھے بن گئے تھے اور اس کا چرچا اب تک چلا آرہا ہے۔ اس لیے ممکن نہ تھا کہ حضرت ثاقب اس سے بچتے۔ اس تبصرے اور محاکمے کا خلاصہ یہ ہے۔

حضرت کی طبیعت میں جدت کم ہے اور کلام میں سوز و گداز بھی۔ البتہ شکوہ الفاظ، متانت بیان اور شاعرانہ لطافت اُن کے اشعار میں ایسی ہے کہ جو داغ کے کلام میں نہیں پائی جاتی۔ وہ اصناف سخن پر قادر اور استاد ماہر ہیں قصائد باشوکت و فرکہتے ہیں اور سخنور باسرمایہ صاحب علم و فضل ہیں ـــ داغ ان اوصاف سے معرّا ہیں۔

آخر عمر میں استاد نے داغ کے رنگ کلام اور قبول عام کو دیکھ کر زبان کی صفائی اور تاثیر کے پیدا کرنے میں کوشش کی اور اس میں وہ ایک حد تک کامیاب ہوئے۔ تاہم صنم خانۂ عشق کی جلوہ آرائی گلزار داغ کی شادابی کو نہیں پہنچی۔ واقعی بات یہ ہے کہ امیر کی استادی میں کلام نہیں ہوسکتا لیکن امیر کا تلمذ، اساتذۂ لکھنو کی ہم بزمی، اہل لکھنو کے کلام کا پیش نظر رہنا، پھر لکھنؤ کی صحبت کا اثر، یہ سب امور مانع

ترقی و کامیابی ہوئے۔ اگر وہ دلّی میں پیدا ہوتے، دلّی کے ارباب کمال
کی ہم نشینی میسر آتی اساتذہ دہلی کا کلام سامنے رہتا اور شاہجہاں آباد
کی سوسائٹی سے مستفید ہوتے تو وہ سخنور بے مانند اور استاد ارجمند ہوتے۔

"مرزا داغ مرحوم کی شوخ طبیعت نے ایک ایسا رنگ اختیار کیا
جس کو غزل کی جان اور اردو شاعری کی روح و رواں کہنا سراسر انصاف ہے۔
مذاق عام نے اس رنگ سے اپنے آپ کو خوب رنگا اور ہر طرف سے
اس پر تحسین و آفرین کے پھول برسائے گئے۔

اعلیٰ جذبات اور خیالات سے استاد امیر کا کلام مالا مال ہے۔ برخلاف
س کے ادنیٰ جذبات اور خیالات مرزا داغ کی شاعری کا سرمایہ ہے۔
اغ نے عشق سے مراد ہوسناکی اور نفس پرستی لی ہے اس لیے ان کی
ماعری میں جذبات عالیہ نہیں ہے۔ جذبات عالیہ کا تعلق حسن و عشق
ے ہے اور داغ کے اشعار خواہشات نفسانی اور جذبات حیوانی سے
پر ہیں۔ مرزا کی شاعری ادنیٰ ہے۔ البتہ زبان ان کے مضمون کے لیے
ن ہے۔ زبان کی بے تکلفی اور شوخی عیاشانہ ان کی شراب کو دو آتشہ
بنتی ہے"

اس محاکمہ میں ایک بات یہ کہی ہے جو عام طور پر اکثر سخن سنج
باب فرمایا کرتے ہیں کہ داغ کا علمی سرمایہ کچھ نہ تھا۔ اس کا جواب
نا شبلی مرحوم نے بہت خوب دیا ہے۔ ان کے الفاظ یہ ہیں:-

اہلِ عرب کا یہ خیال ہے کہ شاعر جس قدر علوم رسمی سے بے بہرہ ہوگا اسی قدر بڑا شاعر ہوگا۔ یہی بات ہے کہ شعرائے جاہلیت کی برابری شعرائے اسلام نہیں کرسکتے۔ فارسی میں دیکھیے تو ہر شخص جانتا ہے کہ فردوسی، انوری اور نظامی کے مقابلے میں جاہل تھا۔ تاہم انوری کو اس کی عبودیت کا اقرار ہے اور نظامی کہتے ہیں:۔

"کہ آراست زلف سخن چوں عروس" جامی علم و فضل میں نظامی سے بڑھ کر ہیں۔ غرض شاعری کا تعلق جذبات سے ہے معلومات سے نہیں۔

اب رہے شاعری کے دوسرے کمال سو اس کی نسبت میری یہ عرض ہے کہ اعلیٰ جذبات اور خیالات نہ امیر میں ہیں نہ داغ میں، سوز و گداز سے بھی دونوں کا کلام خالی ہے۔ حضرت ثاقب نے جو یہ فرمایا ہے کہ "اعلیٰ جذبات اور خیالات سے استاد امیر کا کلام مالا مال ہے"، یہ محض شکوہ الفاظ کا فریب اور لفظی ترکیبوں کی نمود ہے۔ اس میں بعض اوقات اچھے اچھے مبصّروں کو دھوکا ہو جاتا ہے۔ البتہ زبان کی صفائی، محاورات کا بے تکلف استعمال، بیان کی شوخی اور طرز ادا کا بانکپن، یہ ایسی چیزیں ہیں جو داغ کو اردو زبان میں ہمیشہ زندہ رکھیں گی۔

اس کے ساتھ فاضل مؤلف و مرتب نے داغ و امیر کا کلام بالمقابل دیا ہے۔ نظم کے انتخاب کے بعد امیر مرحوم کی نثر کے نمونے دیے ہیں۔ یہ کل حالات اور تبصرے وغیرہ ۱۰۶ صفحے پر آئے ہیں۔

اس کے بعد مکتوبات ہیں۔

خطوط جو بے تکلف دوستوں اور عزیزوں کو لکھے جاتے ہیں وہ لکھنے والے کے خیالات وجذبات کا آئینہ ہوتے ہیں اور جو باتیں ہمیں کاتب کے متعلق ان تحریروں میں مل جاتی ہیں وہ اس کی تالیف و تصنیف میں نہیں ملتیں۔ اس کی سیرت کا صحیح اندازہ اکثر ان خطوط سے ہوتا ہے۔ ان میں وہ اوروں سے نہیں بلکہ زیادہ تر اپنے سے باتیں کرتا ہے اور اس لیے حجاب اور راز دلی خیالات اور جذبات کے اظہار میں مانع نہیں ہوتے۔ اگر یہ صحیح ہے تو ہمیں حضرت امیر مرحوم کے خطوط پڑھ کے بہت مایوسی ہوئی۔ تقریباً تمام خطوط بے لطف، بے مزہ اور روکھے پھیکے ہیں۔ ہم نے یہ خیال کرکے کہ ایک باکمال استاد کے خطوط ہیں اور اس میں کیسے کیسے جواہر ریزے ہوں گے اوّل سے آخر تک تمام خطوط پڑھے لیکن ان میں نہ تو زبان کا لطف ہے نہ طرز بیان کی کوئی خوبی ہے۔ نہ کہیں ادبی نکات بیان فرماتے ہیں اور نہ کہیں شعر وسخن پر کوئی ایسا خیال ظاہر فرمایا ہے کہ پڑھنے والے کو بصیرت ہو اور نہ کوئی ایسی بات ہے کہ جس سے واقعات وحالات زمانہ پر کسی پہلو سے روشنی پڑے۔ ہر خط میں آلام و امراض گوناگوں کا رونا اور قلت صحت کا شکوہ ہے یا پیام و سلام اور خیروعافیت یا روزمرہ کی بہت معمولی باتیں ہیں۔ بیان کرنے والے انھیں باتوں کو بعض اوقات

اس طرح بیان کرجاتے ہیں کہ جنھیں پڑھ کر دل مزے لینے لگتا ہے مگر یہاں یہ بھی نہیں - بعض خط ایسے ضرور ہیں کہ ان میں استفسار پر بعض الفاظ اور محاورات کی صحت اور غلطی پر بحث کی ہے لیکن وہ بھی معمولی باتیں ہیں - کوئی بات ایسی نہیں جس میں کوئی خصوصیت یا جدّت یا خاص تحقیق ہو - لوگ اپنے بزرگوں اور استادوں کی ہر چیز کو مقدس اور متبرک سمجھتے ہیں - عقیدت اور محبت آدمی کو اندھا کردیتی ہے، تنقید نظر نیچی کرلیتی ہے اور انصاف ادھر سے منہ پھیر لیتا ہے - جو صاحب آئندہ ایسا کام کرنا چاہتے ہیں انھیں بہت دیکھ بھال کے بعد ہاتھ ڈالنا چاہیے اور ملک کے سامنے ایسی چیزیں پیش کرنے سے احتراز کرنا چاہیے جو فضول اور بیکار ہوں -

البتہ ان خطوط سے دو باتیں ضرور معلوم ہوتی ہیں - ایک یہ کہ ان کے شاگردوں کا سلسلہ بہت وسیع تھا اور ان سے منشی صاحب مرحوم کو دلی تعلق تھا اور بعض بعض شاگردوں کو وہ بہت عزیز رکھتے تھے - ان کی خوشی سے خوش ہوتے اور ان کے دکھ سے انھیں دکھ ہوتا - دوسرے امیر اللغات کی تالیف میں بڑا انہماک تھا - مگر افسوس کہ کافی امداد بہم نہ پہنچنے سے اس کی تکمیل کی حسرت ان کے دل میں رہ گئی -

ان خطوط سے کہیں زیادہ مفید وہ حصّہ ہے جو حضرت ثاقب نے

ابتدا میں منشی صاحب مرحوم کے حالات اور ان کے کلام کے تبصرہ وغیرہ پر لکھا ہے۔ اس سے ہمارے قدیم شعرا کے خیالات، ان کی صحبتوں، شاگردوں سے ان کے تعلقات، ان کی شاعری اور اصلاح کے طریقوں سے آگاہی ہوتی ہے۔ کیونکہ یہ رسمیں اور طریقے اب اُٹھتے جاتے ہیں اور آئندہ ایک ایسا زمانہ آئے گا جب ان چیزوں کی تلاش ہوگی۔

کتاب کے کل صفحے (۴۰۴) ہیں۔ کاغذ لکھائی چھپائی بہت معمولی۔ دائرۂ ادبیہ لکھنؤ سے دو روپیہ آٹھ آنے میں مل سکتی ہے۔

اصلاحِ سخن

مرتّبہ جناب محمد عبد العلی صاحب شوقؔ سندیلوی صفحات ۲۳۰

عنوان سے کتاب کا مضمون ظاہر ہے، لیکن اِصلاحیں جس ڈھب سے حاصل کی گئی ہیں وہ عجیب و غریب ہے اور قابل مرتب کی جدت طبع پر دلالت کرتا ہے۔ ہماری شاعری میں اساتذہ کی اِصلاحیں بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھی جاتی ہیں اور بعض اصلاحیں جو قدیم استادوں کی دستیاب ہوئی ہیں یا مشہور چلی آتی ہیں وہ بڑی آب و تاب اور فخر کے ساتھ تذکروں یا اسی قسم کی دوسری تالیفات میں درج کی جاتی ہیں۔ کچھ عرصہ ہؤا ہمارے عنایت فرما جناب صفدر مرزا پوری نے بھی ایک کتاب اسی مضمون کی شایع کی تھی، مگر اس میں اور اس میں فرق ہے۔ وہ قدیم اساتذہ کی اصلاحیں تھیں اور یہ ہم عصر شعرا کی ہیں۔ ان اصلاحوں کے بہم پہنچانے میں جناب شوقؔ نے بڑی ستم ظریفی سے کام لیا ہے۔ حضرت نے ایک ہی غزل ہندستان کے مختلف صوبوں کے مشہور شعرا کی خدمت میں بھیجی اور شاگردی کے ادّعا کے ساتھ اصلاح کی درخواست کی۔ بعض کی خدمت میں تو باقاعدہ شیرینی کے دام پیش کرکے شاگردی کی رسم ادا کی ہے۔ ان بزرگواروں نے

حسب معمول شاگرد سمجھ کر غزل میں اپنے فہم کے موافق اصلاح دی اور ازراہ استادی کچھ کچھ ہدایتیں بھی کیں۔ اس طرح انھوں نے اپنی سولہ غزلوں کو جن پر کم و بیش ۳۵ نامور اور مستند شعرا کی اصلاحیں ہیں، اس کتاب میں جمع کر دیا ہے۔ اصلاح کا یہ سلسلہ کوئی پانچ سال تک رہا۔ ایک اقبال اور اکبر مرحوم تو اِن کے دام میں نہیں آئے، باقی کوئی ان کی زد سے نہیں بچا۔ بعض نے دبی زبان سے پیچھا چھڑانا چاہا مگر حضرت شوق کب مانتے ہیں، سر ہوگئے، شاگرد ہو کے رہے، اصلاح لے کے چھوڑی۔ بعض حضرات کو جب اس کی سُن گُن معلوم ہوئی کہ اُن کی اصلاحی غزلیں دوسری جگہ بھی اسی غرض سے گئی ہیں تو انھیں شبہ ہوا اور حضرت شوق سے دریافت کیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ شوق صاحب نے کچھ ایسی تھپکی دی کہ وہ خاموش ہوگئے۔ استادی کا شوق بھی بُرا ہوتا ہے جُل میں آگئے اور برابر اصلاحیں دیتے رہے۔ انھیں اصلاحوں کی یہ پوٹ ہے جو چھپ کر ہمارے سامنے آئی ہے۔

ترتیب کتاب کی یہ ہے کہ پہلے جلی قلم سے اپنی پوری غزل لکھ دی ہے۔ اس کے بعد ہر صفحہ کے شروع میں اپنا ایک ایک شعر جلی قلم سے لکھا ہے اور حاشیے پر اساتذہ کے نام لکھے ہیں اور صفحے کے متن میں اصلاح نقل کر دی ہے، جس شعر پر کسی استاد نے کچھ ارشاد فرمایا ہے وہ بھی اصلاح کے ساتھ لکھ دیا گیا ہے۔ جن حضرات نے جن اشعار پر

صاد بنایا ہے وہاں (ص) بنا کر اُن کے تخلص لکھ دیے ہیں اور جن حضرات نے شعر میں کوئی ترمیم نہیں کی، اُن کے نام ہر صفحے کے آخر میں لکھے ہیں اور کوئی نشان نہیں بنایا ہے۔ اگر کسی استاد نے کمال شفقت سے اُسی زمین میں کچھ اشعار نذر کیے ہیں تو وہ بھی نام کی صراحت کے ساتھ نقل کر دیے ہیں۔

اس مجموعے کو دیکھ کر ہمیں ہنسی بھی آئی اور افسوس بھی ہوا۔ ہنسی تو حضرت شوق کی شوخی پر آئی اور افسوس ان بزرگوں کی سادگی پر ہوا۔ خیر اس کا بھی کچھ مضائقہ نہ تھا کہ وہ یہ سب اِصلاحیں چھاپ دیتے، لیکن غضب یہ کیا کہ کتاب کے آخر میں ان صاحبوں کے وہ تمام خطوط بھی شایع کر دیئے ہیں جو اُنھوں نے زمانۂ اصلاح میں اپنے سعادت مند شاگرد کو لکھے تھے۔ اِن سادہ دل بزرگوں نے شاگرد سمجھ کر کمال بے تکلفی اور سادگی سے جو جی میں آیا لکھ دیا ہے، وہ کیا جانتے تھے کہ اس کا انجام کیا ہونے والا ہے۔ ایک صاحب شاگردی کی مٹھائی مانگ رہے ہیں، دوسرے اپنے دیوان کے مصارف کے لیے چندے کا اصرار فرما رہے ہیں۔ تیسرے صاحب نے شاگردی کی مٹھائی کے ساتھ استاد کی خدمت کا بھی صاف صاف اشارہ کیا ہے۔ ایک صاحب فرماتے ہیں کہ جواب کے لیے آدھ آنے کا ٹکٹ جو بھیجا ہے تو کیا اب سندیلے میں لڈو نہیں بنتے؟ ان بے چاروں کو کیا معلوم تھا کہ ان کا

شاگرد رشید یہ بھانڈا چوراہے میں پھوڑے گا۔ غرض حضرت شوق نے اپنے "اساتذۂ کرام" کا نام اچھالنے اور اُن کی رسوائی میں کوئی دقیقہ اُٹھا نہیں رکھا۔ جناب شوق اس کی وجہ یہ بتاتے ہیں کہ "اس درمیان (یعنے زمانۂ اصلاح) میں اساتذہ کے جو خطوط نکات ادبیہ کا گنجینہ نظر آئے وہ بھی ضمیمے کے طور پر آخر کتاب میں درج کردیے گئے ہیں۔ اگر کسی استاد کو یہ امر کچھ ناگوار گزرے تو مجھے معاف کریں۔ میں نے جو کچھ کیا ہے وہ ضیافت طبع ارباب ذوق کے لیے کیا ہے۔ اور اساتذۂ معتبرہ کے فیوض عام کرنے کے لیے" اوّل تو یہ خط نکات ادبیہ کا ایسا گنجینہ نہیں جیسا کہ حضرت شوق فرماتے ہیں اور اگر کچھ ادبی بحث ہے بھی تو چاہیے تھا کہ وہی خط چھاپتے جس کا تعلق ادب سے ہے غیر متعلق خطوط یا خطوط کے ایسے حصوں کو چھاپنے سے جن میں کوئی ادبی بحث نہیں، ان کا کیا مقصد ہے؟ شاید "ضیافت طبع ارباب ذوق" مدّنظر ہو۔ طبع کے بعد معافی مانگنا یہ اور ستم ہے۔ ہمارے خیال میں اُن کو یہ حق حاصل نہ تھا کہ وہ خانگی خطوط بغیر اجازت کے شایع کرتے۔ مگر شاگرد تو بیٹے کے برابر ہوتا ہے، اُسے اجازت کی کیا ضرورت ہے۔

ظاہر ہے کہ جب یہ سفینۂ زرّین حضرات اساتذہ کی خدمت میں پہنچے گا تو بہت جھنجلائیں گے، بگڑیں گے، خفا ہوں گے، مگر اس سے

کیا حاصل ؟ جو ہونا تھا سو ہوگیا۔ مصلحت یہ ہے کہ اب خاموش رہیں اور اس سے عبرت حاصل کریں اور شاگردوں کی اصلاح سے پہلے اپنی اِصلاح حال کی طرف متوجہ ہوں۔

اب رہی اصلاح، جس کے مفید ہونے پر بڑا طومار باندھا گیا ہے، سو واجبی ہی واجبی ہے۔ بعض صاحبوں نے اصلاح کے شوق میں سرے سے مضمون ہی بدل دیا ہے کوئی صاحب مطلب نہیں سمجھے اور شعر کاٹ کے رکھ دیا ہے۔ کسی نے اصلاح دے کر شعر کو پست کردیا ہے اور کہیں مضمون ہی خبط ہوگیا ہے۔ البتہ کہیں کہیں کوئی اصلاح اچھی بھی نظر آجاتی ہے۔ خیر جو صاحب بصیرت ہیں وہ تو ان اصلاحوں کو دیکھ کر ان کی حقیقت سمجھ لیں گے، لیکن جو مبتدی ہیں یا جنھیں شعر کہنے کا نیا نیا شوق ہوا ہے، انھیں بڑی الجھن پیدا ہوگی اور کچھ تعجب نہیں کہ وہ اصلاحوں کے اس طومار سے گم راہ ہوجائیں۔ جہاں حضرت شوق نے اتنا کھٹراگ کیا تھا اگر وہ ہر شعر کی اصلاحوں پر ایک مختصر سا محاکمہ بھی ساتھ ساتھ لکھ دیتے تو بہت اچھا ہوتا اور اس حالت میں یہ کتاب کچھ نہ کچھ ضرور مفید ہوجاتی۔

اس کتاب میں ایک دوسری جدّت یہ ہے کہ حضرت نیاز فتح پوری صاحب نے تو شروع میں کتاب کی تقریب لکھی ہے، دیباچہ ہمارے محترم مولانا شرر مدظلہٗ نے تحریر فرمایا ہے، مقدمہ جناب سلطان حیدر

صاحب جوش نے لکھا ہے، تبصرے جناب امیر احمد صاحب علوی اور ہمارے شفیق مکرم جناب ڈاکٹر صدیقی صاحب نے تحریر فرمائے ہیں۔ یہ سب تحریریں سنجیدہ اور بڑی شان کی ہیں اور پڑھنے کے قابل ہیں۔

ہم بھی جناب شوق کے شکرگزار ہیں کہ انھوں نے ادبی تفریح کا ایسا اچھا سامان جمع کیا ہے جو کسی دوسرے سے ممکن نہ تھا اور جو محنت اور کاوش انھوں نے اس میں اٹھائی ہے وہ فی الحقیقت قابل داد ہے۔

اُردو شہ پارے
جلد اوّل

مرتبۂ ڈاکٹر سیّد محی الدّین قادری، ایم۔ اے، پی۔ ایچ۔ ڈی
مکتبہ ابراہیمیہ اسٹیشن روڈ، حیدرآباد دکن

مکتبۂ ابراہیمیہ نے اردو کلام کے انتخابات شایع کرنے کی تجویز کی ہے۔ جو بہت اچھا کام ہے۔ اس کی پہلی جلد شایع ہوچکی ہے۔ اس میں اُردو ادب کے آغاز سے ولی کے زمانے تک کے شاعروں اور نثر نگاروں کا کلام انتخاب کیا گیا ہے اور ساتھ ہی ساتھ مصنفین کے حالات بھی درج ہیں۔

پہلے باب میں اردو ادب کے ابتدائی کرشموں کا ذکر ہے۔ دوسرے باب میں بیجاپور، تیسرے میں گولکنڈہ اور چوتھے میں مغلوں کی حکومت کے شعرا اور نثر نگاروں کا ذکر ہے۔ اڈنبرا کی بیاض سے بعض مرثیہ گو شعرا کا کلام بھی انتخاب کیا گیا ہے۔

کتاب کی ترتیب بہت اچھی ہے۔ کتاب کے آخر میں آٹھ ضمیمے اور

ایک فرہنگ ہی۔ ضمیموں میں ہر باب کے مصنفین اور کتابوں کی فہرست مع سنین ہی۔ ایک ضمیمے میں اڈنبرا کے بیاض کے مرثیہ گو شاعروں کی فہرست اور اُن کے مرثیوں کی تعداد ہی۔ ایک ضمیمہ سنین کا ہی۔ سب سے آخر میں اُن مشکل الفاظ کی فہرست ہی جو ان انتخابات میں آئے ہیں۔ علاوہ اس کے سات شاعروں کی تصویریں اور کلیات سلطان محمد قلی قطب شاہ میں سے چار قطعوں کے چربے بھی دیے ہیں جن سے کتاب کی رونق بڑھ گئی ہی۔

اس کتاب میں بھی وہی خامی پائی جاتی ہی جو مؤلف کی ہر کتاب میں نظر آتی ہی۔ یعنی عجلت۔ بعض نوجوان انشاپردازوں کو مصنف بننے کی اس قدر عجلت ہوتی ہی کہ ان کے کاموں میں ایسی قابل افسوس خامیاں رہ جاتی ہیں جو صرف محنت اور غور کرنے ہی سے رفع ہو سکتی ہیں۔ یہ نکتہ ہر نوجوان انشاپرداز کو پیش نظر رکھنا چاہیے۔ چنانچہ اس قسم کی خامیاں جو عجلت اور پریشانی کا نتیجہ ہیں اس کتاب کے ہر صفحے پر نظر آتی ہیں۔

یہ خامیاں کئی قسم کی ہیں۔

اوّل:۔ ایسے الفاظ جو درحقیقت مشکل اور اجنبی ہیں فرہنگ میں نہیں ہیں۔ مثلاً بھیدنا، سانت، مگمگن، داکھ، نبلی، لبدنا، ابھال، پارک (پارکھ) وغیرہ وغیرہ فرہنگ میں نظر نہیں آتے۔

دوم :- جس کلام کا انتخاب کیا گیا ہے، اس کے پڑھنے میں محنت اور غور نہیں کیا گیا اور جیسا غلط سلط لکھا ہوا تھا ویسا ہی نقل کر دیا گیا ہے۔ مثال کے طور پر یہ مصرع

جیوں پھول تازا بن مینے جیوں پوتلی بوجن مینے

بے معنے ہے۔ یہ لفظ بوجن نہیں بلکہ لوچن ہے "پوتلی" پتلی ہے لوچن کے معنے آنکھ کے ہیں۔ یعنے آنکھ کی پتلی۔ اسی طرح دوسرا مصرع

دندی تیری شہرت سے بورسے اہیں

ہے۔ اس کے کچھ معنے نہیں ہو سکتے۔ یہ لفظ "بورسے" نہیں بلکہ بوڑے ہے۔ بوڑے کے معنے دکنی زبان میں بہرے کے ہیں۔ اس قسم کے شعر کثرت سے ہیں جو غلط نقل کر دیے گئے ہیں اور پھر حاشیے میں نہ تو ان کی تشریح کی کوشش کی گئی ہے اور نہ یہ اشارہ کیا گیا ہے کہ ان کی صحت نہیں ہو سکتی۔ انتخابات کی کتابیں بہت قابل قدر ہوتی ہیں اور اس لیے ان کی صحت کی طرف خاص طور پر توجہ کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ ایسے انتخابات جن میں غلط اور صحیح کی کوئی تمیز نہ ہو محض بیکار ہیں۔ خاص کر ایسے کلام کے انتخاب میں جو قدیم ہے اور ایسی زبان میں ہے جو اب عام طور پر نہیں بولی جاتی، اس کی صحت کامل اور غور سے ہونی چاہیے۔

سوم :- اکثر الفاظ کے معنے غلط دیے ہیں اور محض قیاس سے

لکھ دیے گئے ہیں - مثلاً ادھار کے معنے غذا اور خوراک دیے گئے ہیں جو صحیح نہیں - وہ لفظ اہار ہی - ادھار کے معنے بھروسے اور اعتماد کے ہیں - اسی طرح اپنگ کو اپنک لکھا ہی اور اس کے معنے بہت بتائے ہیں جو بالکل غلط ہیں "بارا" کے معنے سردی کے لکھے ہیں حالانکہ اس کے معنے ہوا کے ہیں - "درماں" کے معنے تعظیم لکھے ہیں حالانکہ یہ دو لفظوں سے مرکب ہی اور مان بمعنے وآن ہی یعنے عزت والا - "رہس" کے معنے شوق اور امنگ کے لکھے ہیں - ان معنوں میں یہ لفظ کبھی استعمال نہیں ہُوا - اصل میں یہ لفظ امس ہی کسی غلط نسخے میں رہس لکھا ہوگا ویسے ہی نقل کردیا گیا - "سکن" کے معنے بُری گھڑی کے دیے ہیں اور تشریح یہ کی ہی کہ "سو" بمعنی بُری اور گن بمعنی گھڑی یعنے بُری گھڑی - یہ لفظ دو معنوں میں آتا ہی - ایک تو شگون کے معنوں میں اور دوسرے گنواں یعنی خوبیوں والے کے معنوں میں - "سو" الفاظ کے شروع میں بطور سابقہ کے ہمیشہ اچھے معنوں میں آتا ہی جیسے سگند، سگھڑ وغیرہ - غرض اس قسم کے بیسیوں لفظ ہیں جن کے معنے یا تو غلط لکھ دیے گئے ہیں یا اُن کے پڑھنے میں غلطی کی گئی ہی اور لفظ کچھ کا کچھ ہو گیا ہی -

بعض بعض باتیں اس کتاب میں عجیب ملتی ہیں جس سے ہمارا یہ شُبہ قوی ہوجاتا ہی کہ قابل مؤلف جن کتابوں کے متعلق رائے ظاہر

کرتے ہیں ان کا مطالعہ یا تو انھوں نے بالکل نہیں کیا یا کیا ہے تو محض سرسری۔ مثلاً "نورس" کے متعلق لکھتے ہیں کہ "ابراہیم پہلا بادشاہ تھا جس نے اُردو میں ایک لمبی نظم لکھی ہے اس کا نام نورس اور موضوع موسیقی ہے۔" نورس کو اردو کی کتاب کہنا ایسا ہی ہے جیسے کوئی گیتان جلی کو اردو کی کتاب کہے۔ نورس ٹھیٹ ہندی زبان میں ہے اور اسے اُردو سے کوئی تعلق نہیں۔

دوسری ایک عجیب بات بحری کے متعلق ہے۔ فرماتے ہیں "غالباً وہ بہت اچھا شاعر تھا، بدقسمتی سے راقم کی نظر سے اس کی اُردو نظم 'من لگن'، نہیں گزری۔"

یہ کتاب کئی بار چھپ چکی ہے اور بہت مقبول اور ہر دل عزیز ہے دکن کے ہر شریف گھرانے میں اس کا نسخہ ملتا ہے۔ خود عثمانیہ یونیورسٹی کے کتب خانے میں اس کا نسخہ موجود ہے تعجب ہے کہ یہ عام اور مشہور کتاب مؤلف کی نظر سے نہیں گزری۔

بڑا نقص اس کتاب میں یہ ہے کہ انتخابات کی صحت کا خیال نہیں رکھا گیا۔ یہ محنت طلب کام تھا۔ دوسرا نقص یہ ہے کہ نامانوس اور مشکل اشعار اور الفاظ کا حل نہیں کیا گیا۔ پڑھنے والے کے لیے ایسی کتابیں کسی کام کی نہیں ہوتیں۔

آخر میں میں اس بات کا اظہار افسوس کے ساتھ کرتا ہوں کہ

اگرچہ قابل مؤلف نے رسالۂ اردو کی تحریروں سے بہت کچھ استفادہ کیا ہی اور بعض مصنفین اور تصانیف کی معلومات صرف اسی رسالہ کی بدولت حاصل ہوئی ہیں لیکن اس کی طرف انھوں نے اس طرح اچٹتے ہوئے اشارہ کیا ہی جس سے معلوم ہوتا ہی کہ وہ خود بھی اس سے قبل یا اس سے الگ ان تصانیف کا مطالعہ فرما چکے ہیں، حالانکہ میراںجی شمس العشاق، برہان الدین جانم کی اکثر تصانیف، مجرمی، شوقی، ذوقی، میراںجی خدا نما کے متعلق جو کچھ انھوں نے لکھا ہی اس کا ماخذ صرف "رسالۂ اردو" ہی۔

مثلاً حسن شوقی کے کلام کے متعلق لکھا ہی کہ اس کے کلام کے مخطوطے انجمن ترقیٔ اردو میں بھی محفوظ ہیں۔ بڑی عنایت ہوتی اگر وہ یہ بھی بتا دیتے کہ حسن شوقی کی جن دو کتابوں (ظفر نامہ نظام شاہ اور میزبانی نامہ) کا ذکر انھوں نے اپنی اس کتاب میں کیا ہی وہ ان کی نظر سے گزری ہیں یا نہیں، اور ان کے نسخے اور کہاں کہاں ہیں۔ ایسے مصنف و مؤلف جو حقیقی علم کا ذوق رکھتے ہیں وہ اپنے ماخذوں کے حوالے دینے میں کبھی بُخل نہیں کرتے بلکہ ہمیشہ عالی ظرفی سے کام لیتے ہیں۔

اکبر الہ آبادی

(مؤلفۂ جناب طالب الہ آبادی۔ مطبع انوار احمدی الہ آباد۔ صفحات ۴۸۲

قیمت قسم اوّل مجلد سات روپے آٹھ آنے۔ قسم دوم مجلد پانچ روپے)

زمانہ حال میں اُردو کے تین بڑے شاعر ہوئے ہیں جنھوں نے غزل کی تنگنا سے نکل کر شاعری کے صحیح مفہوم کو سمجھا۔ تینوں کے کلام میں زمانہ کا رنگ نظر آتا ہے۔ حالی کے کلام میں جو درد اور سوز و گداز ہے وہ کسی کو نصیب نہ ہوا۔ وہ مسلمانوں کی خانہ خرابی پر آنسو بہاتا ہے اور اس کے ساتھ اس بگڑے ہوئے گھر کے بنانے کا شوق دلاتا ہے۔ اقبال کا کلام جوش اور غیرت سے بھرا ہوا ہے۔ وہ مسلمانوں کو عمل کی دعوت دیتا ہے اور مغربی تہذیب اور ہندی اثر سے بچنے اور آئین اسلام پر قائم رہنے کی ہدایت کرتا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ اسلام سارے عالم پر چھا جائے اور دنیا کی خرابیوں کا علاج کرے۔ اکبر مغربی تہذیب سے سخت بیزار ہے اور جب وہ مسلمانوں کو اس رنگ میں دیکھتا ہے تو اس سے نہیں رہا جاتا اور ظرافت میں بجھے ہوئے نشتر سے کام لیتا ہے۔ اس کے کلام کی بڑی خصوصیت ظرافت بلکہ

طنز و تشنیع ہے اور ایسے وہ اس مزے سے کہہ جاتا ہے کہ جن کے خلاف ہے وہ بھی لطف لیتے ہیں۔

اکبر کے حالات اور کلام پر متعدد مضامین اور رسالے شائع ہو چکے ہیں لیکن طالب صاحب نے جس تحقیق اور محنت اور تلاش سے اکبر کے حالات لکھے ہیں اور اُن کے کلام کی خوبیوں کو دکھایا ہے وہ اب تک کسی نے نہیں کیا تھا۔ وہ اکبر کے سچّے شیدائیوں میں سے ہیں اور اس کے ساتھ صحیح ذوق رکھتے ہیں۔ تلاش اور جستجو سے گھبراتے نہیں اور یہی وجہ ہے کہ انھوں نے اکبر کے جو حالات محنت اور تحقیق سے جمع کیے ہیں ان کی صحت میں کلام نہیں ہو سکتا، اور اس سے زیادہ اُمید نہیں کہ کوئی دوسرا جمع کر سکے۔ حالات سے زیادہ ان کے کلام سے بحث کی ہے اور مختلف عنوانات کے تحت میں اُن کے کلام کا بہترین انتخاب بڑے سلیقے سے اس طرح مرتّب کر دیا ہے کہ جن کو اکبر کا ضخیم کلّیات مطالعہ کرنے کی فرصت نہیں وہ اسے پڑھ کر بالکل بے نیاز ہو جاتے ہیں۔ کلام کے بعد ان کے بیشمار خطوں کے اقتباسات اس خوبی سے دیے ہیں کہ ان کی زندگی کے ظاہر و باطن کا سارا حال آشکارا ہو جاتا ہے۔ اکبر کے خطوں میں بہت کم وہ خوبیاں ہیں جو ان کے کلام میں ہیں۔

اکبر مذہبی شخص ہیں مگر متعصب نہیں۔ وہ پرانی وضع کے سچّے

مسلمان ہیں وہ اس وضع پر قائم رہنا چاہتے ہیں اور دوسروں کو بھی اسی وضع میں دیکھنا چاہتے ہیں۔ یہ وہ زمانہ تھا جب کہ نئے خیالات امڈے چلے آتے تھے اور پرانے خیالات کے پاؤں اکھڑ رہے تھے کہ اکبر نے مشرقی تہذیب کی حمایت میں اپنی آواز بلند کی اور مغربی تہذیب کے شیدائیوں کی حماقتوں اور فضولیوں کی ہنسی اڑانی شروع کی۔ وہ علی گڑھ کی جدید تحریک پر زہر میں بجھی ہوئی چوٹیں کرتا ہے، وہ بے پردگی پر طرح طرح کی پھبتیاں کہتا ہے اور نئی تحریکوں اور جدید خیالات کا خوب خاکہ اڑاتا ہے۔ وہ والٹیر کا بالکل ضد ہے۔ اس کا خیال ہے کہ یورپ کی مادّیت سے اسلام اور اسلامی تہذیب خطرے میں ہے اور ان کو مغربی سائنس اور فلسفے سے بچانے کی کوشش کرتا ہے۔ "نئی روشنی" کا سخت دشمن ہے اور اس کی طرح طرح تضحیک کرتا ہے۔ گو وہ یہ سمجھتا ہے کہ اس نے جدید خیال کے دیو کو پست کر دیا ہے لیکن حقیقت میں وہ سائے سے لڑ رہا ہے۔ اسے ایسے کوتہ اندیش ہندی جو اپنی ظاہری طرزِ معاشرت میں یورپینوں کی نقّالی کرتے ہیں، ایک آنکھ نہیں بھاتے۔ اُن کے خلاف اس کا غصہ اور اس کی نکتہ چینی سچّے دل سے ہوتی ہے۔

اس کا طرز شُستہ اور ظریفانہ ہے لیکن اس کے اشعار ہمیشہ بے عیب نہیں ہوتے اس لیے کہ وہ لفظوں کے اُلٹ پھیر اور قافیہ بندی سے

بہت کچھ اثر پیدا کرنا چاہتا ہے۔ اکثر شعر محض قافیہ کی خاطر کہے ہیں، وہ شعر شعر نہیں رہے لطیفے ہوگئے ہیں۔ اس میں بہت کچھ شبہ ہے کہ آیندہ نسلوں میں بھی وہ ایسا ہی مقبول ہوگا جیسا وہ اپنے زمانے میں تھا یا آج کل ہے۔ اس کا فیصلہ کرنا ابھی مشکل ہے کہ وہ اعلیٰ درجے کے شعرا میں تھا یا نہیں، لیکن اس میں کلام نہیں کہ وہ اپنے رنگ میں بے نظیر ہے اور اس کی تقلید نہایت مشکل ہے۔

مذہب پر اکبر کا بہت بڑا اعتماد تھا وہ ایک با خدا اور صوفی منش آدمی تھے۔ لیکن ساتھ ہی وہ بہت بزدل اور ڈرپوک بھی تھے۔ اس اعتقاد پر یہ بزدلی بہت حیرت انگیز ہے۔

زمانہ انتقام لیے بغیر نہیں چھوڑتا۔ اکبر جو مغربی تعلیم اور مغربی تہذیب کے سخت دشمن تھے اپنی اولاد کو اس سے نہ بچا سکے اور خود انھوں نے ان کو وہی تعلیم دلائی جس کی وہ عمر بھر مخالفت کرتے رہے۔

طالب صاحب نے اکبر کی زندگی کا کوئی پہلو نہیں چھوڑا جہاں کہیں ان کو کوئی سقم نظر آیا ہے تو اسے بھی بے تکلف ظاہر کر دیا ہے۔ اس سے قبل جن صاحبوں نے اکبر پر کچھ لکھا ہے ان پر کسی قدر سختی سے تنقید کی ہے خاص کر مؤلف تاریخ ادب اردو پر۔ واقعات کی تحقیق میں لغزش ہو ہی جاتی ہے اس پر اس قدر تشدد درست نہیں، خصوصاً

جب کہ لکھنے والے کی کوئی بدنیتی نہ ہو۔ اس کتاب میں طالب صاحب نے دو جگہ اس مشہور قطعہ کو جس کا دوسرا مصرع "دکھلاکے سبز باغ عذاب و ثواب کا" ہی، سودا سے منسوب کر دیا ہی حالانکہ یہ قطعہ قاضی محمد صادق خان اختر کا ہی۔ اس قسم کی لغزشوں سے کوئی پاک نہیں اور اس لیے ایسی فروگزاشتوں پر سختی سے نکتہ چینی کرنا جائز نہیں۔

ہم طالب صاحب کی محنت، تحقیق اور ذوق کی دل سے داد دیتے ہیں اور ہمیں امید ہی کہ تمام اہل ذوق اس کتاب کی قدر کریں گے۔

فیضانِ شوق

دیوان منشی احمد علی صاحب شوق قدوائی لکھنوی مرحوم
حجم (۳۰۰) صفحے - سائز ۲۰×۲۶ قیمت دو روپے، لکھائی
چھپائی کاغذ بہت عمدہ - مع تصویر مصنف - پتہ:- خان بہادر
شیخ رضی الدین احمد صاحب بیرسٹر ایٹ لا گونڈہ (اودھ)

سحرالبیان منشی احمد علی صاحب شوق قدوائی مرحوم اُردو زبان کے ان استادوں اور مسلم الثبوت شعرا میں تھے جو اپنی خصوصیات کے لحاظ سے آپ اپنی نظیر تھے اور جن کی تمام زندگی اس فن شریف کی خدمت میں گزری ہے۔

اس چند سال کے اندر نہایت افسوس ہے کہ ہماری زبان کے کئی گراں پایہ انشا پرداز اور شاعر ہم سے ہمیشہ کے لیے جدا ہو گئے اور زیادہ افسوس اس کا ہے کہ اپنی خصوصیات اور کمالات بھی اپنے ساتھ ہی لیتے گئے۔ حضرت اکبر الہ آبادی مرحوم، جناب شاد عظیم آبادی، مولانا وحید الدین سلیم پانی پتی، مولانا شرر لکھنوی اور جناب شوق قدوائی اس دور میں ادب اردو کے زبردست ارکان تھے۔

حضرت شوق قدوائی ایک قادرالکلام، کہنہ مشق شاعر اور رنگ قدیم و جدید پر قادر تھے۔ اور یہ عجیب بات ہے کہ وہ بعض خصوصیات کے لحاظ سے مجموعہ اضداد ہستی تھے۔ ان کا دیوان اور غزلیں اگر دیکھیے تو مذاق جدید اور جذبات نگاری سے بالکل الگ ہیں، قدیم رنگ نمایاں ہے اور وہ بھی خاص لکھنؤ کا فرسودہ رنگ۔ رعایت لفظی کی تو اتنی زیادہ نہیں مگر محاورات، ضرب الامثال بول چال نظم کرنے کی خاص کوشش کرتے ہیں اور آورد کو آمد بنانے کی بھی، یہی ان کے دیوان کا امتیازی رنگ ہے۔ اس پر بھی شگفتگی اور برجستگی بہت ہے۔ اور یہ کمال مشاقی کی دلیل ہے کہ کلام گنجلک نہیں ہونے پایا۔ یہ معلوم ہوتا ہے کہ مشکل زمینوں میں طبع آزمائی کا خاص ذوق رکھتے ہیں۔ ان کا زور زیادہ تر لفظی صنایع اور فنی خوبیوں تک ہے لیکن شاید یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ شعر کی اصل روح جو اُسے انسان کے دل کی گہرائیوں تک پہنچا دے وہ نہیں ہے اور ہے بھی تو بہت کم۔ بہ خلاف اس کے ان کی نظمیں نہایت پاکیزہ ہیں اور بعض تو جذبات کی صحیح ترجمانی کے لحاظ سے ملک میں بے حد مقبول ہوئی ہیں خاص کر "عالم خیال"، جس میں ایک ایسی خاتون کے جذبات و خیالات ظاہر کیے ہیں جو اپنے شوہر سے دُور ہے، یہ اپنے گھر میں ہے اور شوہر پردیس میں۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ مرحوم کی ایک بے مثل نظم ہے خصوصاً

ہماری تعلیم یافتہ مسلمان خواتین میں اس نے غیر معمولی مقبولیت حاصل کی ہی۔ اس کے علاوہ اور نظمیں بھی بغایت دل پسند ہیں اور یہ اتنا ذخیرہ ہی کہ اگر کتابی صورت میں چھپے تو اچھا خاصا حجم ہوگا۔ اور ہمارا یہ خیال ہی کہ مرحوم کے دیوان سے زیادہ اس وقت اُن کے مجموعۂ نظم کی ملک کو ضرورت تھی۔

زیرِ تنقید دیوان میں غزلیں ہیں، مگر یہ غزلیں اس رنگ میں نہیں جو آج کل مقبول ہی اگرچہ زیادہ حصہ آخر عمر اور درمیانی عمر کا ہی کیونکہ ابتدائی عمر کا کلام زیادہ تر ضائع ہوگیا اور جو بچ رہا تھا اس کا بھی اکثر و بیشتر حصّہ خود مصنف نے اپنے ذوق کے سبب تلف کر دیا۔ آخر دیوان میں چند اخلاقی قطعات اور رباعیاں ہیں مگر ان میں بھی جانِ شاعری کی وہی کمی ہی جو غزلیات میں ہی۔ ایک امتیازی خصوصیت دیوان کی یہ ہی کہ غزلوں میں زبان نہایت صاف و شُستہ اور صحیح استعمال کی ہی اور اشعار کی تعداد بہت کم رکھی ہی جو متقدمین کی خصوصیت تھی۔ رعایت لفظی زیادہ نہیں لیکن صحت زبان اور محاورات و ضرب الامثال بندی کے سوا اور کوئی بات مشکل سے موجودہ دورِ ادب اور مذاقِ سلیم کے لیے دل چسپ ہو سکتی ہی۔

دیوان کے شروع میں مرحوم کے صاحبزادے شیخ ظاہر علی صاحب کا ایک صفحے کا دیباچہ ہی۔ اس کے بعد مولوی معین الدین صاحب

بی اے (کنٹب) بیرسٹرایٹ لا لکھنؤ کا ایک بسیط مقدمہ ۲۸ صفحات کا ہی جس میں مصنف کے سوانح حیات، خصوصیات کلام، خصائل، مزاج، تصانیف و کلام پر تبصرہ اور بہت سی باتیں آگئی ہیں تاہم ہمارے خیال میں یہ مقدمہ ابھی تشنہ ہی، اس میں کئی اور اہم چیزیں رہ گئی ہیں ایک تو ان کی تصانیف کا ذکر تفصیلی نہیں ہی، بعض کا نام تک مذکور نہیں، دوسرے ان کے تلامذہ کا بالکل ذکر نہیں۔ اس کے علاوہ بعض اور بھی قابل تذکرہ باتیں چھوٹ گئیں۔

دیوان اس مطلع سے شروع ہوتا ہی:-

مرا حق مان کر بن تو مرا حاجت روا ہوتا
کہ میں مانے ہوئے ہوں اے خدا تیرا خدا ہوتا

پہلے مصرعے کے لفظ بن پر دورانِ طباعت میں بحث ہو چکی ہی آخر میں تمام "عقیدت مند اسی نتیجے پر پہنچے کہ اپنی کوتاہ نظری تسلیم کرلی جائے اور ان پر حرف نہ رکھا جائے مطلع بجنسہٖ رہنے دیا جائے لیکن یہ ہمارے خیال میں زبردستی ہی، جو بات سچ ہو وہ کہنی چاہیے کہ بن یہاں کسی طرح نہیں کھپتا، ورنہ ردیف بیکار ہوتی ہی۔ کیا لکھنؤ میں اب کوئی ایسا زبان داں نہیں جو اس معمے کو حل کرتا یا اسے کم از کم کتابت ہی کی غلطی سمجھ لیا جاسکتا۔ یہ مطلع طبع دیوان کے وقت ہمارے ایک دوست کے پاس بغرض استفسار آیا تھا تو انھوں نے یہ لکھ دیا تھا

کہ یہ لفظ (بن) نہیں بلکہ (ہی) یا (بھی) ہے، اس صورت میں مطلع ٹھیک ہو جاتا ہے۔ اور شعرا نے بھی اپنی اپنی رائیں پیش کیں مگر عقیدت مند کب مانتے ہیں۔ یہ پہلی غزل حمد میں ہے، شعر کی ہے مگر کوئی شعر خاص طور پر قابل ذکر نہیں، دو ایک شعروں میں ناگوار تنقید بھی ہے دوسرے صفحے سے عشقیہ کلام شروع ہوتا ہے؛ پہلا مطلع یہ ہے:-

بکتے بکتے تو تو اے ناصح مرا سر کھا گیا
دل گیا میرا تو پھر تیری گرہ سے کیا گیا

یہ "تیری گرہ سے کیا گیا" نظم کرنے کے لیے کہا گیا ہے۔ ایسے شعر وہ خود بہت پسند کرتے اور فخریہ جھوم جھوم کر سناتے تھے۔ دوسرا شعر ملاحظہ ہو:-

کچھ شباب آتے ہی آج اس پر توکل اس پر ستم
اک ذرا سا حسن کیا پایا کہ تو اترا گیا

اس میں زبان کا جو لطف ہے، وہ تو اہلِ نظر سے مخفی نہیں لیکن پہلے مصرعے میں (کچھ) کچھ یونہیں سا ہے، اور دوسرے میں "ذرا سا حسن"، معشوق کے لیے کہنا صحیح ذوقِ محبت کے منافی ہے۔ سچ یہ ہے کہ حضرت شوق کی شاعری محبت کی شاعری نہیں بلکہ رسمی غزل گوئی تلازمہ و محاورہ بندی ہے۔ اور فرماتے ہیں:-

مرے منہ پر کسی سے لے کے تجھ کو پان کھانا تھا ترے ہونٹوں کو میرے خون کا بیڑا اٹھانا تھا

یہ آہیں چند میں نے کھینچ دیں صرف اوپرے دل سے
اثر کی کب تمنّا تھی فقط اُس کو ڈرانا تھا

آہیں کھینچ دینا، یا کھینچ لینا، دونوں ٹھیک نہیں۔ آہیں کھینچیں ہی فصیح معلوم ہوتا ہے۔ پہلے شعر میں "مرے مُنہ پر" بھی اچھا نہیں ہے اس زمین میں یہ شعر خوب کہا ہے:-

تمھاری، غیر کی، ناصح کی، اب توسب کی سُنتے ہیں
کسی کی ہم نہیں سنتے تھے وہ بھی اک زمانہ تھا

حقیقت میں بہت پاکیزہ شعر ہے۔ یہ حالت ایک وقت انسان پر گزرتی ہے اور پھر ضرور اس کی یاد آتی ہے۔

ذیل کے مطلع میں بھی ایک بات نظم کی ہے، یہ اور اس قسم کے کثرت سے اشعار ایسے ہیں جن پر خود مصنف کو ناز تھا اور بہت سے احباب وعقیدت مند محض مروّتاً شوق سے سُنتے اور جوش وخروش سے داد دیتے تھے۔ آخر میں تو وہ صرف لغت وزبان کی سند کے لیے شعر کہا کرتے تھے اور چاہتے تھے کہ محاورات نظم میں بندھ جائیں تاکہ لُغت کی کتابوں کے لیے سنداً آیندہ کام آئیں فرماتے ہیں۔

دل کھوتا ہے، ہم کو اس سے رازِ عشق نہ کہنا تھا
"گھر کا بھیدی لنکا ڈھائے" اِتنا سمجھے رہنا تھا

کیوں ہنستے ہو، میں جو برہنہ آج جنوں کے ہاتھوں ہوں
کچھ دن گزرے میں نے بھی خوش رنگ لباس اک پہنا تھا

خوش رنگ لباس سے غالبًا جوگیا لباس مراد ہے جو بعد کو شدت جنون نے اتار پھنکوایا اب شاعر ننگا پھر رہا ہے اور لوگ اس فطری لباس پر ہنس رہے ہیں - یہ مقطع میر تقی کی شاعری اور اسی دورِ قدیم کی یاد دلاتا ہے -

ہمت ہاری، جی دے بیٹھے، سب لذّت کھوئی اے شوق
مرنے کی جلدی ہی کیا تھی، عشق کا غم کچھ سہنا تھا

متقدمین کی طرح چھوٹی اور طویل بحروں میں آخر عمر میں بہت طبع آزمائی کی ہے - مگر دل میں وہ درد، وہ کسک نہیں، نہ صحیح مذاق شعری اور محبت کی چاشنی ہے - بعض بعض شعر ضرور قابل قدر ہیں، یہ شعر بھی بڑے مزے کا ہے :-

آنکھ اس ادا سے اس نے دکھائی کہ میں نے شوق
چپکے سے اپنا مے کا بھرا جام رکھ دیا

کوئی نئی بات نہیں، مضمون پامال و فرسودہ ہے لیکن زبان کی صفائی و سادگی اور بندش کی برجستگی و چستی نے خاص مزہ پیدا کر دیا ہے - شعر انھیں کے رنگ کا ہے -

ابر کھرا اور ٹھکانا ڈھونڈیں دل بہلانے کا — اب سے آئے گھر سے آئے نام نہیں گھر جانے کا

اس کے دوسرے مصرعے میں بھی ایک محاورہ کامیابی کے ساتھ
نظم کیا ہے۔ رام پور کے قیام میں جب کہ حضرت شوق کا آخری دور تھا
وہ ایسی بحروں میں فکر کرتے تھے۔ قدرت کلام حاصل تھی، مگر رعایت
لفظی اور محاورہ بندی ہاتھ سے کہاں جاتی ہے۔ درد و اثر، جذبات نگاری
محاکات، جو تغزل اور شعر کی جان ہے بہت کم پائی جاتی ہے۔ البتہ
کہیں کہیں کچھ جھلک ہے۔ مثلاً

بو آتی ہے ساتھ ہر نفس کے — کچھ جلنے لگا کباب کا سا
بیٹھ گیا شوق، اک گلی میں — کیا جانیں کیا جی میں آیا
شباب آیا، وہ آفت ڈھا رہے ہیں — نئی دولت ملی اترا رہے ہیں
نہ پوچھو غم میں دل کے ضعف کا حال — کہاں کا دل ہمیں اب کیا رہے ہیں
جتنے ٹکڑے ہیں دلِ ناکام کے — سب نگینے ہیں تمھارے نام کے
پڑتی ہے تجھ پر فرشتوں کی نظر — منہ چھپا او سونے والے بام کے
سن کے میرا نام بولے کون شوق؟ — سینکڑوں دنیا میں ہیں اس نام کے

کیا مزے دار شعر کہے ہیں، زبان کی سادگی قابلِ داد ہے
اور سنیئے۔

کچھ دل کی سناؤں کچھ جگر کی — بیٹھو تو کہوں ادھر ادھر کی

ذیل کا شعر کیا لاجواب کہا ہے:۔

دامن کو ذرا بچائے رہنا — دنیا نہیں گرد ہے سفر کی

ٹ گئی عمر لکھتے لکھتے خط اور ابھی حالِ عشق مجمل ہی
بہر حال دیوان شوق جیسا کہ مقدمہ نگار صاحب نے لکھا ہی "زیادہ تر
اس غرض کے لیے ہی کہ آیندہ کے طالبان فن اور محققین زبان ان کے
تائج کنب بینی اور پنجاہ سالہ تجربہ سے فائدہ اٹھائیں" مگر شاعرانہ
ل فریبیاں بھی اس کے صفحات میں ملتی ہیں اور وہ قدیم طرز میں بھی
بندش سے بعض اوقات خاص لطف پیدا کر دیتے ہیں۔ مثلاً

ہم نہ مانیں کہ کھُلی سُرخی خواب آنکھوں سے
پھوٹ نکلا ہی ترا رنگِ شباب آنکھوں سے
دو گھڑی کے لیے وہ آئے تو دو گھر لوٹے
لے گئے چھین کے دل سینے سے خواب آنکھوں سے

کیا مشکل زمین ہی جس میں (آنکھوں سے) ردیف ہی، مگر کیا
چھے اچھے شعر اپنی مشاقی اور قادر الکلامی سے نکال لیے ہیں۔ اور دیکھیے:-

اتنی تو اس نے کی مری دل سوزیوں کی قدر
تُربت پہ اک چراغ سرِ شام رکھ دیا
گل ہو کے ہیں کیا ہنستا ایسا نہ تھا غم میرا
شبنم کی طرح گزرا روتے ہی جنم میرا

اس میں جنم گزرا باندھا گیا ہی، خدا جانے یہ کہاں تک بلحاظ
، ٹھیک ہی۔ نئے نئے قافیوں اور ردیفوں میں کثرت سے دیوان شوق

میں غزلیں ملیں گی۔ یہ کیا خوب کہا ہے:-

روئے سے میرے کھل گیا ظالم پہ دردِ عشق
ہچکی جو آئی منہ سے کلیجہ نکل پڑا

ذوق وظفر کی طرح ہم لکھ چکے ہیں کہ حضرت شوق کو محاورہ بندی ومثل بندی کا جیسا شوق ہے ویسا ہی مشکل زمینوں میں بھی کہنے کا ذوق وملکہ رکھتے ہیں اور ایسے ایسے شعر نکالے ہیں کہ ان کی قدرت کلام کو ماننا پڑتا ہے مگر اپنا رنگ ہاتھ سے نہیں جانے دیتے۔ فرماتے ہیں:-

میں غیر ہوں اس سے یہ کھٹک جائے تو اچھا
دل اس کا مرے دل سے اٹک جائے تو اچھا
دل مرا ٹوٹا تو اس کو کچھ ملال آ ہی گیا
اپنے بچپن کے کھلونوں کا خیال آ ہی گیا
وصل کی شب مجھے کیا کیا ہوئے دھڑکے اے شوق
اس کی پرچھائیں میں تھا نور سحر ہی کا سا
کچھ ہٹا رنگ اس کی مہندی کا تو لطف آنے لگا
چاند کا ٹکڑا وہ ہر ناخن پہ چمکانے لگا

دو شعر یہ بھی کیا خوب ہیں:-

ہاتھوں سے منہ چھپا کر دل مفت لو کسی کا
پھر بھی کہیں ہوا ہے سودا ہنسی خوشی کا

پامردیٔ جنوں نے کیا کیا دکھائیں سیریں
وارفتہ ہو گیا ہیں صحرا کی زندگی کا

یہ زمین دیکھیے:-

سر کو کسی معشوق پہ وار آؤں تو اچھا
جن عشق کا یوں سر سے اتار آؤں تو اچھا

اس قسم کا ابتذالِ مذاق ہمارے قدیم استادانِ فن کے کلام میں اکثر ہی اور یہ نتیجہ ہی لفظی شاعری کا - ذیل کے اشعار میں ایک بات پیدا کی ہی -

جبر شیوہ نہیں اربابِ وفا کا ورنہ
تو مقیدِ کششِ دل کے اثر میں رہتا

حسن خالق نے دیا تھا تو دیا تھا لیکن
یہ بھی کیا اس نے کہا تھا کہ ستمگر ہونا

جان اب نہیں باقی ہی مجھے دفن کرا دو
تم دل پہ نہ جاؤ یہ اُچھلتا ہی رہے گا

دل کا دینا مجھے کیا آپ ہی منظور ہوا
پھٹ پڑی اس پہ جوانی تو میں مجبور ہوا

میری قسمت سے ہوا نذرِ تغافل وہ بھی
میں تو سمجھا تھا کہ جور اب ترا دستور ہوا

ناخن اب کاوش ہر روزہ کے غم سے چھوٹا
مستقل لطف ہوا، داغ جو ناسور ہوا

ضعف میں بھی کام مثل رنگ چل ہی جائے گا
ہو نہ ہو جنبش مرا پہلو بدل ہی جائے گا

ذیل کا شعر بھی آج کل کون پسند کرے گا۔

یاد آئے گا چھٹی کا دودھ جس دن اے مسیح
اس لبِ معجز نما کا سامنا کرنا پڑا

اس زمین میں اور بھی شعر ہیں مگر ہمارے کام کا کوئی نہیں، ابتذال کا ایک شعر اور دیکھیے :-

بلبل سے لڑا دیتے ہیں گل مجھ کو دکھا کر
دیتے ہیں وہ دھوکا کہ یہ ہو گال ہمارا

یہ شعر اچھا کہا ہی :-

میں کس امید پہ دیکھوں ستم ظریف کا منھ
جواب ایک تبسم ہی سو سوالوں کا

یہ پوری غزل سلجھی ہوئی اور اچھی ہی۔ پھر کہتے ہیں :-

دل پڑا نظروں کی تیغوں میں تو کٹ ہی جائے گا
ٹکڑے ٹکڑے ہو کے پھر غمزوں میں بٹ ہی جائے گا

ہم وہ نہیں کہ حشر میں غافل ہوں آپ سے
میدان ہی میں اُٹھ کے قدم لیں گے دیکھنا

یہ شعر داد طلب نکل گیا ہے۔

وہ دن فراق کا کہ نہ لائے خدا جسے — اس عشق میں بدا ہے بہر طور دیکھنا
کچھ سہارا مرے جینے کا رہا ہی کب تھا — ابھی مرنا نہیں تم نے یہ کہا ہی کب تھا
دل ہی قابو میں نہیں تجھ پہ جو قابو ہو تو کیا — پاس دونوں سے ہے اب دل ہو تو کیا تو ہو تو کیا
تب تو مارا مجھے حشر آیا تو گھبرائے نا؟ — میں جو کہتا تھا کہ پچھتاؤ گے پچھتائے نا؟
کوئی مقام نظر آگیا جو بن کا سا — کہا جنوں نے کہ یہ ہے مرے وطن کا سا

یہ سب غزلیں مشکل زمین میں ہیں، اور یہ زیادہ تر خود حضرت شوق ہی کی اختراع ہیں۔ شعر تقریبًا ایسے ہی ہیں جیسے یہ مطلعے ہیں؛ یہ شعر غور طلب ہے۔

چمن سے صبر ہے مجھ تک ہوا تو آنے دے
نہ بسنتی کو مرے پنجرے پہ کس صیّاد

اس غزل میں کس، بس قافیہ ہے۔ اور اس شعر میں، پنجرا، بروزن اعلن کہا ہے، حالانکہ زبانوں پر تو پنجرا، بروزن فعلن ہے۔ مقصود شعر صرف بسنتی کو باندھنا تھا اور کچھ نہیں۔ ایک یہ زمین نکالی ہے۔

سبزہ رنگوں پر لہرائے، شوق کریں وہ ننگ تو پھر؟
بھنگ کا کھانا سہل ہے لیکن موجیں لائیں رنگ تو پھر؟

عجیب زمین ہے۔ اس میں شعر کہنا مشکل ہے۔ کلام موزوں البتہ ہو سکتا ہے۔ دوسرے مصرعے میں بھنگ کھانا محل تامّل ہے۔ بھنگ پینا زیادہ متعارف ہے۔

کاکلوں سے عارضی اس کا شباب آیا نظر ۔ گھونگروں سے حسن رخ پا در رکاب آیا نظر
موت آ گئی اب آئے تو کیا دو گے تم آ کر ۔ کچھ نیند نہیں ہے کہ جگا دو گے تم آ کر
ہم بھی ہیں ولولوں پہ جو وہ ہیں اُمنگ پر ۔ دونوں تُلے ہوئے ہیں برابر کی جنگ پر

یہ سب شعر خاص ان کے رنگ کے ہیں۔ یہ شعر کیا خوب کہا ہے:۔

دل پڑ گیا کشاکش امید و بیم میں ۔ در پر کبھی نظر ہے کبھی پاسبان پر

مضمون رشک اکثر شعرا نے باندھا ہے، حضرت شوق فرماتے ہیں:۔

اس رشک سے لکھا نہ کبھی میں نے شوق خط ۔ آئے گا اس کا نام قلم کی زبان پر

یہ شعر بھی خوب کہا ہے اور ایسی زمینوں میں شعرائے موجودہ کو ضرور فکر کرنا چاہیے بلکہ ان کا عام رواج ہونا چاہیے کہ قید ردیف سے آزاد ہوں۔ فرماتے ہیں:۔

وارفتگی عشق میں باقی نہ رہے ہوش ۔ ہستی مری مجھ کو ہوئی اک خواب فراموش
جس ستمگر نے کیا لاکھوں تمنّاؤں کا خون ۔ یاد کرتی ہے تمنّا پھر اسی کو آج کل

"کو آج کل" اس غزل کی زمین ہے۔ مگر پاکیزہ شعر نکالا ہے۔ اور فرماتے ہیں۔

ملنے والے چھوڑتے جاتے ہیں کچھ رنجان کر ۔ جا رہے ہیں ہم دیار بیکسی کو آج کل

یہ ہجر و کچھ چھپا نہیں - چند اور منتخب شعر لکھتا ہوں :-

ظالم کی جفا کم نہ مرا درد جگر کم
ہی لاگ برابر کی ادھر کم نہ ادھر کم

مل کے ہوئے جو آشنا ہم سے نظر نظر سے ہم
کٹ کے ہوئے جدا جدا ہم سے جگر جگر سے ہم

وہ ترس کھا کر جو دل سے مجھ حزیں کی ہی کہیں
لب نمک پروردہ ان کے ہیں انھیں کی سی کہیں

غرور جور کا بانی ہی اور کچھ بھی نہیں
یہ مقتضائے جوانی ہی اور کچھ بھی نہیں

نفس کی چال ترے گھر سے چل کے جاتے ہیں
یہیں پھر آتے ہیں جب ہم نکل کے جاتے ہیں

ہی آئینے میں اپنا محو دیدار آپ ہی اب تو
وہ اپنی ناک چوٹی ہی گرفتار آپ ہی اب تو

گلیوں گلیوں ہم نے لاکھوں کنکر پتھر کھائے ہیں
لوگوں نے دیوانہ پاکر ناک چنے چبوائے ہیں

ان دونوں مذکورہ شعروں میں صرف دو محاورے باندھنے تھے ، وہ تو بندھ گئے مگر مذاق لطیف کا خون ہو گیا - اور سنیے -

دل ہی فریادی کہ دست ظلم کا کل ہی دراز
باندھ لو جوڑا کہ قصہ مختصر ہی کیوں نہ ہو

یہ غزل کیا خوب کہی ہی :-

دل لے کے گئی ہی کہ جگر لے کے گئی ہی
کچھ تو مرے پہلو سے نظر لے کے گئی ہی

اللہ کرے آج نہ پلٹائے اسے یاس
امید جسے جانب در لے کے گئی ہی

باد سحری ان کو مرا حال دکھانے
سوکھا ہوا اک برگ شجر لے کے گئی ہی

ذیل کا شعر مصنف نے نکال دیا ، مگر ہمیں یاد رہ گیا تھا ، دیوان میں نہیں ہی -

برچھی سے کہیں میں نے چرایا نہیں پہلو
جب آئی ہی تب لخت جگر لے کے گئی ہی

یہ غزل کیسی مشکل زمین میں ہے مگر مطلع ہی سے اس کا اندازہ کرلیجیے۔

رووٗں ای بادل تو جل تھل بھر کے چھوڑوں تو سہی
تجھ کو میں پانی سے پتلا کر کے چھوڑوں تو سہی

"تو سہی"، کی ردیف میں صرف اپنا کمال اور مشاقی دکھانا تھا: ابتذال کی حد ہو گئی۔ یہ شعر خوب کہے ہیں:۔

ہر روز ترقی پہ جو ہے حسن کی صورت ایک ایک سے ملتی نہیں تصویر کسی کی

اس قافیے میں یہ شعر خوب کہا ہے اور مجھے بہت پسند آیا۔

پہنچا ہے جنوں تک اثر جوش گل ایسا بلبل سی چہکنے لگی زنجیر کسی کی

عشق کی ہمت کرے وہ جس سے مرتے بن پڑے کام تو اچھا ہے لیکن جب یہ کرتے بن پڑے
گر پڑا ہاتھ سے آئینہ یہ ہم نے دیکھا پوچھے اب اُن کے تحیر کو انھیں سے کوئی
ان بلاؤں نے کہاں سے مرا گھر دیکھ لیا کہ فلک سے کوئی آتی ہے زمیں سے کوئی
وہ خوش کہ ہے جگر کو نظر میں لیے ہوئے ہیں خوش کہ ہوں نظر کو جگر میں لیے ہوئے
زلفوں سے دل کو پھینک دو ورنہ عمر بھر بیٹھے رہو گے درد وہ سر میں لیے ہوئے

دوسرے مصرعے میں "درد کو"، تھا پھر مصنف نے درد وہ۔ بنایا لیکن حقیقت یہ ہے کہ 'کو' اور 'وہ' دونوں برائے بیت ہیں۔ ذیل کا شعر کیا خوب کہا ہے حالانکہ زمین بہت مشکل ہے۔

خدا ہی ہے مری توبہ کا جب ساقی کہے مجھ سے ارے پی بھی کہاں کی پارسائی لے کے بیٹھا ہے

دیکھنا اس کا نہ ہوا ای شوق اگر مدّ نظر — آنکھ میں پُتلی تو پُتلی میں نظر ہی کیوں بنے

بچپن میں جو اُڑاتے تھے کل پر لیے ہوئے — سر آج اُڑا رہے ہیں وہ خنجر لیے ہوئے

قد جو اوروں سے ہی نیچا تو نہ شرماؤ تم — تاڑ سے باغ میں نخل گل تو نیچا ہی ہے

دونوں شعر ابتذال ذوق کے گواہ ہیں اور ذیل کے شعر خوب ہیں۔

ہماری جان وہ کیا لیں بدن میں جب ہو بھی
بدن بھی گھل کے مٹا پیرہن میں جب ہو بھی

غالبًا اہل زبان ایسی جگہ 'جب ہو بھی' کی جگہ 'ہو بھی' اب کافی اور فصیح سمجھتے ہیں۔

دراز دستی زلف رسا کے ہم قائل — مگر کہاں دل وحشی بدن میں جب ہو بھی

چھری کے وار پہ دل سے دعا نکلتی ہے — کسی کا ہاتھ کسی کی زبان چلتی ہے

بتاؤں کیا شب فرقت میں سانس کی حالت — تمام رات چھری سی جگر پہ چلتی ہے

ہوا نہ بگڑے کہاں تک دیار الفت کی — تری زبان تو ہر وقت زہر اُگلتی ہے

ہوا ہو، چاہے زمانہ ہو چاہے رنگت ہو — زیادہ سب سے تمھاری نظر بدلتی ہے

مذکورہ غزل کیا خوب کہی ہے، مشکل زمینوں میں دو تین شعروں کی اور زحمت فرمایئے۔

تیر کو کیوں دوں کہ جس رُخ جائے وہ دل لے کے جائے — دوں نظر کو جو پھرے اور سوئے قاتل لے کے جائے

جھڑکیاں ان کی سہوں میں یہ تو ممکن ہے مگر — مسکرا ہی کیوں نہ دیں غصّہ اُتر ہی کیوں نہ جائے

یہ جناب شوق قدوائی مرحوم کے رنگ تغزل پر ایک بسیط نظر تھی، حقیقت

یہ ہے کہ اس کے لیے وہ پیدا ہی نہیں ہوئے تھے۔ مگر زمانے کی بدمذاقی بہالے گئی اور پھر ایسا رنگ چڑھا کہ طبیعت ثانیہ بن گیا۔ ورنہ وہ صرف بیانیہ نظموں کے لیے پیدا ہوئے تھے۔ اور ان کی بہت سی نظمیں بے مثل ہیں، بہت مقبول ہیں کورس میں شامل ہیں، اور ارباب ذوق شوق سے پڑھتے ہیں ہمیں یقین ہے کہ ان کے بلند اقبال صاحب زادے شیخ ظاہر علی اور لائق داما شیخ رضی الدین صاحب بیرسٹران کی نظموں کو بھی اسی شان اور اہتمام سے جلد چھپوا دیں گے اور مقدمے میں جو کمی رہ گئی ہے وہ پوری ہو جائے گی تاکہ اس بلند پایہ شاعر کی اصلی کاوش فکر کے نتائج سے دنیا محروم نہ رہے اور یوں دیوان کے مطالعے کے بعد ناظرین مایوس نہ ہوں بلکہ اس کوفت کی پوری تلافی ہو سکے۔

اُردو لٹریچر

مؤلفہ ڈاکٹر گریہم بیلی ڈی - لٹ - بی - ڈی ، ایم - اے ،
ریڈر ہندی و اُردو ، لندن یونیورسٹی
(صفحات ۱۰۷ ، قیمت دو رُپے)

ڈاکٹر بیلی زمانہ حال کے اُن چند انگریزوں میں سے ہیں جنھوں نے اپنے قیام ہندستان میں علاوہ فرض منصبی کے اپنا وقت ہندستان کی بعض زبانوں کی تحصیل و تحقیق میں صرف کیا اور اس کے بعد بھی اپنے شوق کی تکمیل کرتے رہتے ہیں - ہندستان میں کلیسائے اسکا چستان کے تعلق سے ان کا قیام پنجاب میں رہا - پنجابی ، ہندی اور اردو زبان بخوبی جانتے ہیں - اس سے قبل انگریزی پنجابی لغت ، نیز ہمالیہ پہاڑ کی لسانیات اور پنجابی صرف و نحو پر ان کی کتابیں شایع ہو چکی ہیں - یہ کتاب (اردو ادب کی تاریخ) ان کی آخری تالیف ہے - چونکہ ڈاکٹر صاحب اُردو زبان سے خوب واقف ہیں اس لیے زمانۂ حال میں اردو کی تاریخ و تحقیق کے متعلق جو کتابیں اردو زبان میں لکھی گئی ہیں یا جو مضامین اس تحقیق کے متعلق اردو کے رسالوں میں شایع ہوتے رہتے ہیں اُن سے اُنھوں نے اپنی اس

تالیف میں حتیٰ الامکان پورا استفادہ کیا ہے اور سو صفحے کے اندر اردو زبان کی پوری تاریخ کا خلاصہ پیش کردیا ہے گویا دریا کو کوزے میں بند کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہاں تک کہ ابتدائی زمانے کے بعض ایسے مصنفوں کا بھی ذکر کردیا ہے جو غالباً کسی بڑی تاریخ میں بھی قابل ذکر نہ سمجھے جاتے۔

ابتدائی اردو کے ابواب کے ماخذ زیادہ تر پنجاب میں اردو، قدیم اردو، اردو شہ پارے اور رسالہ اردو کے وہ مضامین ہیں جو اس رسالہ میں ابتدائی اردو کے متعلق وقتاً فوقتاً شایع ہوتے رہے ہیں، لیکن ڈاکٹر صاحب نے اپنے قابل شاگرد (مؤلف شہ پارے) کی طرح، بقول ایک نقاد کے، رسالۂ اردو کے مضامین کا حوالہ دینے کی "قسم کھا رکھی ہے"۔ جہاں تک ابتدائی اردو کا تعلق ہے، اردو کی تقسیم میں "اردوئے قدیم" کا اتباع کیا ہے۔ ابتدائی دور پر کتاب کا بڑا حصہ صرف ہوگیا ہے باقی حصہ اتنا تفصیلی نہیں۔ پوری کتاب کے مضامین کی تقسیم یہ ہے۔

مختصر دیباچے کے بعد جس میں اردو شعر کی بحروں، شعر کے اقسام اور اعلیٰ اور نامی شعرائے اردو کے اسما ہیں پہلا باب شروع ہوتا ہے۔ اس میں اردو کی ابتدا اردو کے نام اور زبانوں میں اردو کی حیثیت سے کی ہے۔ دوسرے باب میں ابتدائی اردو کی تاریخ ہے جس میں صوفی اور عالم شعرا، قطب شاہی اور عادل شاہی زمانوں کے شاعروں، دکن میں مغلوں کے شاعروں، دکن میں مغلوں کے عہد کے مصنفوں اور آخر میں ولی کے

نوجوان ہم عصروں کا ذکر ہی۔ تیسرے باب میں دہلی کی شاعری کی پہلی صدی کا حال ہی جس میں حاتم، مظہر، سودا، میر، درد، میرحسن، مصحفی، انشا، اثر، نظیر نصیر آگئے ہیں۔ چوتھے باب میں انیسویں صدی کے لکھنوی شاعر ہیں یعنے خلیق، ضمیر، شہیدی، دیا شنکر نسیم، آتش، ناسخ، شرف، صفا، وزیر، رند رشک، برق، مہر، بحر، خلیل، آباد، اختر، (واجدعلی شاہ) قلق، ذکی، درخشاں، اختر، انیس، دبیر، مونس، شوق، عشق، نفیس، رشید، عارف، پانچویں باب میں دہلی کے دوسرے عہداور رام پور کے چار شاعروں کا ذکر ہی۔ اس میں ذوق، غالب، مومن، ظفر، نسیم، تسکین، شیفتہ، آزردہ، سالک، درخشاں، ثاقب، تاباں، سائل، زکی، ظہیر، انور، مجروح اور (رام پور کے چار شاعر) امیر، داغ، تسلیم، جلال ہیں۔ چھٹا باب اردو نثر پر ہی جس میں چند ابتدائی نثاروں، فورٹ ولیم کالج کے مترجمین اور انیسویں صدی کے ارباب نثر کا تذکرہ ہی۔ ساتواں باب عہد جدید کے شعرا پر ہی جس میں حالی، آزاد، محمد اسمٰعیل، اکبر، سرور، نادر، محسن، شاد، عظمت اللہ خاں ہیں۔ آٹھواں اور آخری باب چار صفحے کا خاتمہ ہی جس میں ڈاکٹر صاحب نے اردو نظم و نثر پر اپنی رائے کا اظہار کیا ہی اور انجمن ترقی اردو ہندستانی اکیڈمی عثمانیہ یونیورسٹی اور دارالمصنفین کا سرسری ذکر اور اقبال پہ مختصر تبصرہ ہی۔

اس چھوٹی سی کتاب کو جس کا حجم سو صفحے سے زیادہ نہیں ایسے

شاعروں کے ذکر سے جو اردو ادب میں کوئی حیثیت نہیں رکھتے یا ابتدائی دور کے ایسے اشخاص کے تذکرے سے جنھیں شاعر کہنا بد ذوقی کی دلیل ہی، زیربار کرنا کسی طرح جائز نہ تھا۔ عجیب بات یہ ہی کہ بعض ایسی بے حقیقت کتابوں کا ذکر کردیا ہی جن کے مصنف گمنام و بے نشان ہیں اور بعض ایسے غیرمعروف اور ناقابل لحاظ شاعروں کے نام آگئے ہیں جن کی کوئی کتاب یا نظم دستیاب نہیں ہوئی - یہ زیادہ بہتر ہوتا کہ وہ ہر عہد کے ایسے نامی شعرا کو لیتے جن کا اردو شاعری میں خاص درجہ ہی اور جنھوں نے اردو شاعری اور شعر پر اپنا اثر قایم کیا تھا اور اس عہد اور پھر اس عہد کی خصوصیات کو کسی قدر زیادہ تفصیل اور بصیرت سے بیان کرتے - اس قسم کی مختصر کتابیں جزوی "تذکروں اور لاحاصل اسم شماری کی متحمل نہیں ہوسکتیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ کتاب ایک ادبی فہرست ہوگئی ہی۔

ڈاکٹر صاحب نے چند مباحث کے متعلق ذاتی جدت کا دعویٰ کیا ہی۔ مثلاً (۱) اردو کی ابتدائی تاریخ کی ابتدا اور اصل (۲) اردو میں دکنی کی اہمیت اور دکنی شعرا کا ذکر (۳) تحسین کی نوطرز مرصع، میرامن کی باغ و بہار اور امیر خسرو کی چہار درویش کے متعلق جدید معلومات لیکن کتاب کے مطالعہ سے اس جدّت کی ساری حقیقت معلوم ہوجاتی ہی۔ نمبر (۱) کلیتاً پروفیسر شیروانی کی محققانہ تالیف "پنجاب

میں اردو" سے ماخوذ ہے۔ نمبر (۲) رسالۂ اردو کے مضامین، اردوئے قدیم یا ان دونوں کے خوشہ چینوں سے منقول ہے۔ نمبر (۳) راقم کے مقدمۂ باغ و بہار کا رہین منت ہے۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ یہ چیزیں اب تک انگریزی زبان سے روشناس نہیں ہوئی تھیں۔

ڈاکٹر صاحب کی حیثیت ایک ناقل کی سی ہے اور مشہور ہے کہ نقل میں عقل کو بہت کم دخل ہوتا ہے۔ اس لیے اُن سے جگہ جگہ، خصوصاً ابتدائی دور میں جسے وہ اپنا بڑا کارنامہ سمجھتے ہیں، لغزشیں سرزد ہوئی ہیں ۔ ان لغزشوں کی کئی وجوہ ہیں ۔ ایک تو نقل در نقل ہونے سے دوسرے ایسے ماخذوں سے استفادہ کرنے سے جو ناقابل اعتبار ہیں۔ تیسرے ایسے ماخذ جن سے انھوں نے رجوع کیا ہے وہ ہیں تو قابل اعتماد لیکن کاتب کی غلطی سے بعض الفاظ یا نام غلط چھپ گئے ہیں اور ویسے ہی نقل کر دیے ہیں اور چونکہ فاضل مؤلف نے ایسے مقامات پر حوالہ دینے سے احتراز کیا ہے اس لیے وہ سب غلطیاں انھیں پر تھپ گئی ہیں۔ ہم یہاں صرف چند موٹی موٹی غلطیوں کا ذکر کرتے ہیں۔

(۱) قصۂ ابو شحمہ کا مصنف محمد امین نہیں ہے۔ میرے پاس اس کے متعدد نسخے ہیں کسی میں امین یا محمد امین نہیں آیا۔ بلکہ ہر نسخے کے آخر میں اس کا نام "اولیا" لکھا ہوا ہے۔ (صفحہ ۲۶)

(۲) ملک خوشنود کی ایک تصنیف یوسف زلیخا بتائی ہے اور لکھا ہے

کہ یہ امیر خسرو کی یوسف زلیخا کی پیروی میں لکھی گئی ہے۔ خوشنود نے
یوسف زلیخا نہیں لکھی اور نہ امیر خسرو کی تصنیف سے کوئی مثنوی
یوسف زلیخا ہے۔ (صفحہ ۲۸)

(۳) ہاشمی کی دو تصانیف بتائی ہیں ایک یوسف زلیخا اور دوسری
"احسن القصص" یہ غلطی بچوں کی سی ہے۔ یوسف زلیخا کے قصے ہی کو
احسن القصص کہا گیا ہے۔ یہ دو کتابیں نہیں ایک ہی کتاب ہے۔
اس میں ڈاکٹر صاحب کا قصور نہیں۔ انھوں نے بلفظہ یہ عبارت
"اردو شہ پارے" سے نقل کی ہے۔ البتہ تعجب مؤلف "اردو
شہ پارے" سے ہے۔ ہر معمولی پڑھا لکھا مسلمان بلکہ اکثر ان پڑھ
مسلمان بھی یہ جانتے ہیں کہ قرآن پاک میں یوسف زلیخا کے قصہ
کو احسن القصص کے نام سے یاد کیا ہے۔ (صفحہ ۳۰)

(۴) مصنف قصۂ ملکۂ مصر و قصۂ فیروز شاہ کا نام "محمد علی عاجز" غلط
ہے۔ اس نے خود اپنی تصنیف ملکۂ مصر میں اپنا نام محمود بتایا ہے۔
عاجز تخلص بھی غلط ہے چنانچہ وہ کہتا ہے۔

اے محمود اب پیر کا ناؤں لے   ختم کر درازی سو اب چھوڑ دے

یہ غلطی "اردوئے قدیم" سے بے سمجھے نقل کرنے سے ہوئی ہے۔ (صفحہ ۳۰)

(۵) عارف الدین عاجز کے متعلق لکھا ہے کہ اس کے ہم نام (عاجز)
کی ایک تصنیف اس سے منسوب کردی گئی ہے۔ یہ غلط ہے۔ عاجز

اورنگ آبادی کی کوئی تصنیف کسی دوسرے دکنی عاجز سے منسوب نہیں کی گئی۔ مصنف کو مغالطہ ہؤا ہو یا کسی کتاب کی عبارت کو غلط سمجھ کر یہ لکھ دیا ہی۔ (صفحہ ۳۲)

(۶) شاہ بیراللہ ہجری کی تصنیف (منظوم سب رس) کا نام "گلشن حسن دل" لکھا ہی۔ اس کا اصل نام "گلشن جشن دل" ہی۔ راقم نے اس کتاب کا ذکر اپنے ایک مضمون (رسالۂ اردو) میں کیا ہی۔ کاتب نے غلطی سے "جشن" کی بجائے "حسن" لکھ دیا۔ مؤلف شہ پارے نے وہی غلط نام اپنی کتاب میں (بغیر حوالہ) نقل کر دیا اور ڈاکٹر بیلی نے نقل در نقل۔ کتاب استاد شاگرد دونوں نے نہیں دیکھی، حوالہ دیتے نہیں غلطی معلوم ہو تو کیونکر (صفحہ ۳۲)

یہی کیفیت ہمیں دوسرے شعرا و مصنفین کے حالات میں نظر آتی ہی مثلاً محمد قلی قطب شاہ کے کلام پر تفصیلی رائے، اس کے اشعار اور صفحات کی تعداد نہایت وثوق کے ساتھ دی گئی ہی حالانکہ ڈاکٹر صاحب اور ان کے شریک جرم نے محمد قلی قطب شاہ کے کلیات کی صورت تک نہیں دیکھی۔ اور یہ سب تفصیلات ان دونوں صاحبوں نے لفظ بلفظ رسالۂ اردو کے مضمون سے نقل کی ہیں لیکن حوالہ دینا ان کے مذہب میں روا نہیں۔ یہ تحقیق کا نیا گُر ہی۔ یہی حال ہم شمس العشاق، برہان جانم، ذوقی وغیرہ کے

حالات میں دیکھتے ہیں۔ اسے تحقیق تو نہیں البتہ الہام کہہ سکتے ہیں

(۷) ابوطالب طالب قصبۂ بلنڈہ کے باشندے تھے۔ میرحسن اور قائم نے بھی یہی لکھا ہے کہ بلنڈہ من مضافات اورنگ آباد کے رہنے والے تھے۔ ڈاکٹر صاحب نے غلطی سے حیدرآباد لکھ دیا ہے۔ (صفحہ ۳۲)

(۸) شاہی دو ہیں ایک علی عادل شاہ شاہی اور دوسرے شاہ قلی خان شاہی۔ دونوں کے مرثیے قدیم بیاضوں میں ملتے ہیں جن کو غلطی سے ایک دوسرے سے منسوب کر دیا جاتا ہے۔ شاہ قلی خاں بھاگ نگر حیدرآباد کے تھے، بھاؤ نگر غلط ہے۔ (صفحہ ۲۷)

(۹) نورس کی زبان دکھنی نہیں ہندی ہے۔ یہ بھی اُردو شہ پارے کی غلط نقل کا نتیجہ ہے۔ (صفحہ ۲۷)

(۱۰) وجدی کی تصنیف تحفۂ عاشقین نہیں، تحفۂ عاشقان ہے۔ تعجب ہے کہ اس کی سب سے مشہور و معروف تصنیف "پنچھی باچا" کا ذکر نہیں جو بارہا چھپ چکی ہے۔ (صفحہ ۳۳)

(۱۱) فیض عام کے مصنّف کا نام سیّد محمد نہیں بلکہ عبدالمحمد ہے چنانچہ وہ خود لکھتا ہے۔

کیا ہے جو دکھنی زباں میں کلام	رکھا ناؤں اس کا یقین فیض عام
یہ عبدالمحمد جو ہے مہدوی	ابی مجتبیٰ مہندی متقدی

(صفحہ ۳۷)

(۱۲) قیاسی کا صحیح نام سیدی عبداللہ ہے سید عبداللہ غلط ہے۔ (صفحہ ۳۷)

(۱۳) آرزو کی تصنیف "نوادر الفرض" نہیں بلکہ "نوادر الالفاظ" ہے۔
ڈاکٹر صاحب نے غلطی سے "غرائب اللغات" کو بھی آرزو سے منسوب کردیا ہے حالانکہ یہ عبدالواسع ہانسوی کی تصنیف ہے (صفحہ ۳۹)

(۱۴) جُرأت کے متعلق لکھا ہے کہ اس نے زیادہ نہیں لکھا حالانکہ اس کا کلام بہت ضخیم ہے جو اب تک شایع نہیں ہُوا۔ (صفحہ ۵۶)

(۱۵) سوز کے متعلق بھی یہی غلطی کی ہے۔ اس شاعر کا کلام بھی بہت ضخیم ہے مگر چھپا نہیں۔ سوز کے متعلق دوسری غلطی یہ کی ہے کہ دہلی سے ان کا جانا سنہ ۱۷۷۷ء میں لکھا ہے حالانکہ وہ اس سے بہت قبل جا چکے تھے۔ سودا کے ساتھ فرخ آباد میں مہربان خان کے ہاں تھے۔ سودا نے فرخ آباد سنہ ۱۷۷۵ء میں چھوڑا۔ سودا کا قیام سترہ اٹھارہ سال فرخ آباد میں رہا، اس عرصے میں وہ فرخ آباد ہی میں تھے۔ اس لحاظ سے سوز ۱۷۵۷ء کے لگ بھگ فرخ آباد آگئے تھے (صفحہ ۵۱)

۱) مصحفی نے ایک نہیں بلکہ تین تذکرے لکھے ہیں۔ دو ریختہ گو اور ایک فارسی گو شعرا کا۔ (صفحہ ۵۳)

) سودا کے متعلق لکھا ہے کہ آصف الدولہ نے ملک الشعراء کا خطاب دیا حالانکہ دہلی ہی میں سنہ ۱۱۶۵ھ سے قبل دربار دہلی سے یہ خطاب

مل چکا تھا، میرؔ نے بھی اس کا ذکر کیا ہے۔

(۱۸) سوداؔ کے غلام "غنچہ" کا ذکر کسی تذکرے میں نہیں صرف آزاد نے لکھا ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے عجیب مضحکہ خیز انداز میں اس کا ذکر خیر فرمایا ہے۔

(۱۹) قائمؔ کے متعلق لکھا ہے کہ اس کی سب سے بڑی کامیابی رباعی گوئی میں ہے ہماری رائے میں یہ صحیح نہیں لکھا ہے کہ اس کا کلام سنہ ۱۹۲۷ء میں طبع ہوا۔ یہ بھی صحیح نہیں۔

(۲۰) دیاشنکر نسیمؔ کی مثنوی گلزار نسیم کے متعلق لکھا ہے کہ یہ میر حسن کی مثنوی سحر البیان سے بہت مشابہ ہے۔ یہ رائے بہت ہی حیرت انگیز ہے۔ نسیمؔ کے متعلق یہ بھی لکھا ہے کہ اس نے الف لیلہ کا اردو میں ترجمہ کیا۔ یہ صریحاً غلط ہے۔ اس غلطی کا ارتکاب گارسان دتاسی نے کیا ہے اور اس کی نقل ڈاکٹر صاحب نے کی ہے۔

(۲۱) میرؔ اور سوداؔ کے دور کے دو مشہور شاعروں کا ذکر بالکل ترک کر دیا ہے حالانکہ بہت سے غیر معروف اور کم سواد شعرا کا ذکر کیا گیا ہے۔ ایک سید عبدالولی عزلت ہیں جو صاحب دیوان ہیں اور ان کی تصنیف سے "راگ مالا" ایک مشہور مثنوی ہے۔ میر صاحب نے اپنے تذکرے میں ان کی بیاض سے بہت مدد لی اور دوسرے تذکرہ نویسوں نے بھی ان کی بہت تعریف کی ہے۔

دوسرے فقیہ دردمند شاگرد مظہر ہیں۔ ان کا ساقی نامہ بہت مشہور ہے۔
خود مظہر جان جاناں نے اپنے ایک شعر میں ان کی تعریف کی ہے۔
اساتذۂ وقت نے ان کے ساقی نامہ کو بے مثل تسلیم کیا ہے۔

(۲۲) عبدالحی خاں صارم کے متعلق لکھا ہے کہ وہ آصف جاہ کا پہلا وزیر
تھا۔ہم صرف اس قدر جانتے ہیں کہ وہ شاعر تھا اور جوان فوت
ہوا۔ آصف جاہ کا پہلا وزیر صارم کا باپ عبدالرزاق صمصام الدولہ
شاہ نواز خان مؤلف مآثرالامرا و بہارستان سخن تھا۔

(۲۳) ڈاکٹر صاحب تحریر فرماتے ہیں کہ مولانا نذیر احمد نے بے نظیر کے نام
(یا عنوان) سے چند نظمیں لکھی ہیں۔ یہ بات نہیں ہے بلکہ سید افتخار عالم
مرحوم نے ان کی نظموں کا مجموعہ نظم بے نظیر کے نام سے شایع کیا تھا۔

اس تبصرے میں ہم نے ان کی بعض رایوں سے
بحث نہیں کی جو انھوں نے بعض شعرا کے متعلق ظاہر کی ہیں۔
ان میں سے اکثر وہ ہیں جو دوسری جگہ سے منقول اور ماخوذ ہیں
اور بعض ان کی ذاتی ہیں، ورنہ یہ بحث بہت طویل ہو جاتی۔

ڈاکٹر صاحب نے فورٹ ولیم کالج کلکتہ کے مترجمین کا ذکر تو
تفصیل سے کیا ہے لیکن دہلی کالج کی ورنیکلر ٹرانسلیشن سوسائٹی اور اس کے
مترجمین کا مطلق ذکر نہیں کیا حالانکہ ان کا کام فورٹ ولیم کالج کے مترجمین
سے کہیں زیادہ قابل قدر اور اہم تھا۔ فورٹ ولیم کالج کا کام زیادہ تر

صرف افسانوں اور قصہ کہانیوں تک رہا مگر دہلی کالج کے مترجمین نے حقیقی علمی کام کیا۔ اس کا ذکر اردو ادب کی تاریخ میں نہایت ضروری تھا

ایک انگریز اپنے سیاحت نامے میں لکھتا ہے کہ اہل ہند ہمیں حقارت کی نظر سے دیکھتے ہیں اور اس کے ثبوت میں اس نے یہ امر پیش کیا ہے کہ یہ لوگ ہمیں (انگریزوں کو) طنزاً "گورا" (یعنے گھوڑا) یا گھوڑ منہا کہتے ہیں۔ یورپی شخص کی زبان سے گھ اور ڑ کا تلفظ ادا نہیں ہوتا اور وہ گورا اور گھوڑا کو ایک ہی طرح بولتا ہے۔ اس سے یہ مغالطہ ہوا۔ یہی حال ان یورپی محققین کے ہاتھوں "کھری بولی" کا ہوا۔ یہ لوگ "کھڑی اور "کھری" میں فرق نہیں کر سکتے نتیجہ یہ ہوا کہ یہ کھڑی کے معنے کھری اور کھڑی بولی کے معنے پاک صاف، شستہ اور عام مستند زبان سمجھتے رہے۔ ہمیں اس سے خوشی ہوئی کہ ڈاکٹر صاحب نے اس مغالطہ کو رفع کیا ہے۔ لیکن اصل غلطی میں یہ بھی مبتلا ہیں۔ کھڑی اور کھری کا فرق انھوں نے بہت صحیح بتایا ہے لیکن معنے تقریباً وہی رکھے ہیں جو کھری کے ہیں یعنی مروجہ، علم مستند (Standard) زبان اور دوسرا غضب کیا ہے کہ "کھڑی بولی" کو ایک خاص زبان قرار دیا ہے اور اس کی دو شاخیں بتائی ہیں ایک ہندی اور دوسری اردو۔ ڈاکٹر صاحب کا یہ خیال صحت سے اسی قدر بعید ہے جس قدر ان کے پیشرو یورپی محققین کا۔ کھڑی بولی کے معنے ہندستان میں عام طور پر گنواری بولی کے ہیں جیسے

ہندستان کا بچہ بچہ جانتا ہی۔ وہ نہ کوئی خاص زبان ہی اور نہ زبان کی کوئی شاخ۔

باوجود ان نقائص اور اختلافات کے ڈاکٹر صاحب کی یہ کتاب انگریزی میں پہلی تالیف ہی جس میں مختصر طور پر اردو ادب کی تاریخ کا خاکہ ایک خاص ترتیب کے ساتھ پیش کیا گیا ہی اور ابتدا سے اب تک جو جو تغیرات اور ترقی عہد بعہد زبان میں ہوئی ہی اسے اس خوبی سے بیان کیا ہی کہ زبان کا پورا نقشہ ذہن میں آجاتا ہی۔ طلبہ اور خاص کر ان لوگوں کے لیے جو انگریزی میں اردو ادب کی اجمالی کیفیت جاننا چاہتے ہیں یہ کتاب ضرور بکار آمد ہی۔

نورُاللّغات

ابتدا میں اُردو لغت کی کتابیں اہل یورپ اور خاص کر انگریزوں نے لکھیں جن میں ڈاکٹر ہنٹر، ڈاکٹر ہیرس، ڈاکٹر گلکرسٹ، ڈاکٹر فوربس، جان شکسپیر، ڈاکٹر فیلن اور پلیٹس کی زیادہ مشہور ہیں۔ اہل زبان نے اُس طرف بہت بعد میں توجہ کی اور حیرت کی بات ہے کہ اہل زبان کی کتابیں اکثر ناقص اور ناقابل التفات ہیں۔ البتہ مولوی سید احمد مرحوم کی کتاب فرہنگ آصفیہ ایسی ہے جو مکمل اور مستند کہی جا سکتی ہے اگرچہ وہ بھی غلطیوں سے پاک نہیں اور بہت کچھ اصلاح طلب ہے لیکن اس میں شک نہیں کہ مرحوم نے اُردو زبان کی بہت بڑی خدمت انجام دی اور اس سے ملک کو بے حد فائدہ پہنچا۔ اردو زبان کو ابھی صحیح مستند اور مکمل لغت کی کتابوں کی شدید ضرورت ہے۔ کوئی زبان اس سے بے نیاز نہیں ہو سکتی اور جس زبان میں اعلیٰ درجہ کی محققانہ لغت کی کتابیں نہیں ہیں وہ زبان مہذّب نہیں کہلا سکتی۔ ہمیں اس سے حقیقی مسرّت ہوئی کہ مولوی نورالحسن صاحب نیّر ایک مدّت سے اُردو لغت کی ترتیب اور تکمیل میں مصروف ہیں اور اس وقت اس کا پہلا حصّہ جس میں پہلے دو حرف

الف اور بے ہیں چھپ کر شایع ہو گیا ہی - اس میں ہر لفظ پر تفصیل سے بحث کی ہی - چنانچہ یہ حصہ بڑی تقطیع کے (۴۰۷) صفحے پر ہی - مؤلف کی محنت اور تحقیق قابل داد ہی - جہاں تک ممکن ہوا ہی ہر لفظ کی اصل بھی ساتھ ساتھ لکھ دی ہی - ہماری لغت کی کتابوں میں ہندی الفاظ کی طرف سے عموماً بے توجہی کی گئی ہی لیکن اس لغت میں اکثر ہندی الفاظ کا مادہ بتا دیا گیا ہی اور ہر لفظ کے تحت میں اس کے محاورات تفصیل کے ساتھ دیے ہیں اور ہر لفظ اور ہر محاورے کے لیے مستند شعرا اور اہل زبان کے کلام سے سند بھی بیان کر دی ہی - اس میں ہمارے لغت نویسوں نے بہت افراط سے کام لیا ہی - ہر لفظ کے لیے سند میں شعر کی ضرورت نہیں ہی - اس لغت میں بھی اس کی پیروی کی گئی ہی - مثلاً بڑ (برگد) کے لیے انشا کے شعر کی ضرورت نہ تھی -

ہمارے لغت نویسوں نے صرف تحریری زبان کو پیش نظر رکھا ہی اور اس کی وجہ ظاہر ہی کہ بول چال کی زبان ہر حصے میں اس قدر مختلف ہی کہ ہر مقام کے الفاظ لغت میں لکھنا ممکن نہیں - لیکن کیا یہ درست نہ ہوگا کہ اگر کوئی لفظ کسی مقام پر ایسا بولا جاتا ہی جس کا مترادف دلی اور لکھنؤ کی زبان میں نہیں پایا جاتا - تو اُسے لغت میں داخل کر لیا جائے؟ یہ امر ان صاحبوں کے لیے قابل غور ہی جو اپنی زبان کی لغت لکھنا چاہتے ہیں -

جب دو یا دو سے زائد الفاظ مل کر ایسی ترتیب سے استعمال ہوں جو اہل زبان بولتے ہیں اور اس میں کسی قیاس یا تغیر و تبدل کو دخل نہ ہو یا جب یہ ایسے معنے پیدا کریں جو حقیقی معنوں سے الگ ہوں تو وہ محاورہ کہلاتا ہے لیکن جب یہ عام یا حقیقی معنوں میں استعمال ہوں تو وہ محاورہ نہیں کہلاتا۔ مثلاً فاضل مولف نے بڑا کی تحت میں بڑا نکیلا ہے، بڑا ہی سخت ہے، بڑا تقدیر والا ہے وغیرہ جو محاورے لکھے ہیں وہ بالکل غیر ضروری معلوم ہوتے ہیں۔ یہاں بڑا بطور صفت یا تمیز کے نکیلا، سخت اور تقدیر والا کے ساتھ عام معنوں میں استعمال ہوا ہے اور کوئی خاص معنے پیدا نہیں کرتا ورنہ اگر اس قسم کے جملے اور الفاظ لکھنے کا التزام کیا جائے تو کتاب اس قدر ضخیم ہو جائے گی کہ اس کے لیے بیسیوں مجلدات کی ضرورت ہوگی۔ اسی طرح آپ کی شکایت ہے، سر آنکھوں پر، آپ کا منہ ہے وغیرہ جو محاورے لکھے گئے ہیں ان کے متعلق یہ امر قابل غور ہے کہ آیا محاورے آپ کے تحت میں آنے چاہییں یا نہیں کیونکہ یہ یہ محاورے صرف "آپ" سے مخصوص نہیں ہیں بلکہ دوسری ضمیروں اور اسموں کے ساتھ بھی استعمال ہوتے ہیں۔ ہماری رائے میں پہلا محاورہ "سر آنکھوں" اور دوسرا "منہ" کے تحت میں آنا چاہیے۔

ہندی یا کسی دوسری زبان کا غیر مانوس لفظ استعمال کیا جاتا ہے تو اہل زبان ناک بھوں چڑھاتے ہیں اور اُسے جائز نہیں خیال کرتے۔

لیکن عربی، فارسی اس قید سے مستثنیٰ معلوم ہوتی ہے۔ مصنفین ثقیل سے ثقیل اور غیر مانوس عربی فارسی کے لفظ بے تکلف اپنی تحریروں میں استعمال کرجاتے ہیں اور شعرا تو قصائد میں بالکل آزاد ہیں۔ اس نظر سے اگر عربی فارسی کے لفظ اُردو لغت کی کتابوں میں داخل کیے جائیں تو عربی فارسی کے لغات نصف سے زیادہ اردو کی لغت میں آجائیں گے۔ مثال کے طور پر لفظ "استتار" ہے جو فاضل مؤلف نے اس لغت میں لکھا ہے اور سند میں "نوازش" کا شعر تحریر فرمایا ہے۔ یہ لفظ اردو زبان کے لیے بالکل غیر مانوس ہے اور ہم نے اُردو تحریروں میں کہیں اس کا استعمال نہیں دیکھا اور اُردو تو اُردو عربی فارسی میں بھی شاذ ہی استعمال ہوتا ہے۔ نوازش کا شعر اس کے لیے سند نہیں ہوسکتا۔ ہماری رائے میں اردو لغت میں عربی فارسی کے صرف وہی الفاظ داخل کرنے چاہییں جو یا تو اردو زبان میں خاص معنوں میں استعمال ہوتے ہیں یا عام بول چال اور تحریر میں آتے ہیں۔ خاص الفاظ کے لیے عربی فارسی کی لغت کی کتابیں موجود ہیں۔

کتاب کے دیباچے میں لائق مؤلف نے متروکات کی ایک فہرست دی ہے۔ متروکات کا مسئلہ بھی بہت ٹیڑھا ہوگیا ہے۔ بعض اساتذہ نے بعض الفاظ متروک کردیے ہیں اور اپنے کلام میں استعمال نہیں کیے۔ ان کے شاگردوں نے بھی اس کی تقلید کی اور اس طرح متروکات کی تعداد

بڑھتی گئی۔ ہماری رائے میں کسی شخص کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ وہ یہ کہے کہ فلاں لفظ آج سے متروک ہے۔ الفاظ کی حالت بھی جانداروں کی سی ہے۔ بڑھتے گھٹتے ہیں۔ صورت بدلتے ہیں، حیثیت میں فرق آجاتا ہے، بعض نام پیدا کرتے ہیں، بعض گمنام ہو جاتے ہیں، رذیل سے شریف اور شریف سے رذیل ہو جاتے ہیں اور بعض ایک مدت کے بعد مر جاتے ہیں لیکن دانستہ گلا گھوٹنے کا حق کسی کو حاصل نہیں۔ تعجب ہے کہ اس کی ابتدا شعرا کی طرف سے ہوئی حالانکہ شاعر ہی کو ان کی زیادہ ضرورت ہوتی ہے اور بعض اوقات یہ الفاظ کلام میں حُسن پیدا کر دیتے ہیں۔ مثلاً "پہ" (لیکن کے معنوں میں) متروک بنایا جاتا ہے۔ نثر میں متروک ہو تو ہو لیکن کوئی وجہ نہیں کہ نظم میں متروک کر دیا جائے۔ کس قدر مختصر اور خوبصورت لفظ ہے اور ہر لحاظ سے لیکن سے بہتر ہے۔ شاعر اسے بلا تکلف استعمال کر سکتا ہے۔ بھانا بھی متروک ہے حالانکہ اس کی بجائے اردو میں کوئی لفظ نہیں۔ پسند آنا اور پسند کرنا میں اختیار اور ارادہ ظاہر ہوتا ہے اور "بھانا" وہاں استعمال ہوتا ہے جو کوئی شے بغیر ارادہ و اختیار کے خود بخود دل کو اچھی معلوم ہوتی ہے۔ کہتے ہیں کہ "پرے" کا لفظ بھی متروک ہے۔ لیکن جب یہ عرض کیا جاتا ہے کہ اس کی بجائے کیا استعمال کیا جائے تو ارشاد ہوتا ہے کہ "اُدھر"۔ مگر پرے اور ادھر کے معنوں میں بہت فرق ہے۔ اُدھر سمت کو بتاتا ہے اور پرے بُعد کا اظہار کرتا ہے۔ "مت" بھی متروک

سمجھا گیا ہی حالانکہ اس کے معنے خاص ہیں "نہ" یہ کام نہیں دے سکتا۔ "نہ" افعال کی عام نفی کے لیے ہی اور "مت" نہی کے واسطے مخصوص ہی۔ اسی طرح بہت سے لفظ مثلاً خاطر، سو، تو، ناؤ، منڈ جاتا، بھلا (بمعنے اچھا) کانٹھ وغیرہ وغیرہ متروک قرار دیے گئے ہیں۔ ان الفاظ کے متروک ہونے کی کوئی اور وجہ نہیں معلوم ہوتی سوائے اس کے کہ لکھنؤ کے بعض شعرا نے ان کا لکھنا ترک کر دیا۔ اور ظاہر ہی کہ یہ کوئی معقول وجہ نہیں ہو سکتی۔ یہ بحث طویل ہی یہاں اس کی گنجایش نہیں۔ انشاء اللہ آیندہ کسی وقت اس پر علیحدہ بحث کی جائے گی۔ الفاظ کے اعراب کا جو طریقہ مؤلف نے اختیار کیا ہی اس میں کسی قدر تکلّف اور دقّت ہی۔ آج کل جو طریقہ رائج ہو گیا ہی وہ زیادہ آسان ہی۔

ہم فاضل مؤلف کو اس کوشش اور محنت پر جو انھوں نے اس کتاب کی تالیف میں برداشت کی ہی، مبارک باد دیتے ہیں۔ اس میں شُبہ نہیں کہ یہ کتاب موجودہ لغت کی کتابوں میں خاص امتیاز رکھتی ہی اور بعض وجوہ سے سب میں بہتر ہی۔ ہمیں امید ہی کہ اس کا کام جاری رہے گا اور جلد تکمیل کو پہنچے گی۔ ایسی کتابوں کی ملک کو بہت ضرورت ہی۔

مؤلف سے نیّر پریس پاٹا نالہ لکھنؤ سے مل سکتی ہی۔

مجموعۂ نغز

تالیف میر قدرت اللہ قاسم مرتبۂ پروفیسر محمود شیرانی۔ شایع کردہ پنجاب یونیورسٹی۔ موتی لال بنارسی داس تاجر کتب لاہور سے مل سکتی ہے۔

یہ تذکرہ پروفیسر محمود شیرانی نے بڑی احتیاط و اہتمام اور محنت اور صحت سے مرتب کیا ہے۔ جس پر فاضل مرتب اور ان کے طفیل میں پنجاب یونیورسٹی قابل مبارک باد ہے۔

اس میں چھ سو ترانوے شعرا کے حالات درج ہیں اور کتاب کی ضخامت (جو بڑی تقطیع پر ہے) علاوہ دیباچۂ مرتب کے آٹھ سو صفحے سے زائد ہے۔ اس تذکرے کے چھپ جانے سے اُردو مطبوعات میں اور خاص کر اردو شعرا کے تذکروں میں جو اس سے قبل شایع ہو چکے ہیں ایک اچھا اضافہ ہوا ہے۔ یہ کتاب مولانا محمد حسین آزاد مرحوم کے قلمی نسخے پر مبنی ہے جو کسی قدر کرم خوردہ اور بہت خستہ حالت میں تھا۔ دوسرا نسخہ انڈیا آفس کے کتاب خانہ کا تھا جس کی حالت اس سے بھی بدتر تھی۔ اس سے قابل مرتب کی محنت اور کاوش کا اندازہ ہو سکتا ہے۔

اس تذکرے کا سنہ تالیف سنہ ۱۲۲۱ھ ہے۔ اس سے قبل متعدد

تذکرے تصنیف ہو چکے تھے جن کا ذکر شیرانی صاحب نے اپنے دیباچے میں فرما دیا ہے لیکن بعض تذکروں کے سنین تالیف کے متعلق کسی قدر غلطی واقع ہوگئی ہے اس لیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس موقع پر ان کی تصحیح کر دی جائے۔

تذکرۂ گردیزی کا سنہ تالیف ۱۱۶۵ھ بتایا گیا ہے، لیکن خود گردیزی اپنی تالیف کے آخر میں اسے سنہ ۱۱۶۶ھ کی تالیف بتاتے ہیں[1]۔ تذکرۂ میرحسن کے متعلق لکھتے ہیں کہ یہ سنہ ۱۱۸۸ و سنہ ۱۱۹۲ کے مابین کی تالیف ہے۔ لیکن یہ صحیح نہیں معلوم ہوتا اس لیے کہ میرحسن نے سودا کے ذکر میں نواب شجاع الدولہ (متوفی سنہ ۱۱۸۸) کو بقید حیات لکھا ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ تذکرے کی تالیف سنہ ۱۱۸۸ سے قبل شروع ہوگئی تھی اور غالباً سنہ ۱۱۹۲ کے بعد تک جاری رہی کیونکہ فصیح کے حال میں لکھا ہے کہ "در سال یک ہزار و یک صد و نود و دو برحمت حق پیوست" اسی طرح عمدۂ منتخبہ کا سنہ تالیف ۱۲۱۶ھ صحیح نہیں معلوم ہوتا کیونکہ خود صاحب تذکرہ قاسم کے ذکر میں لکھتے ہیں کہ اس وقت سنہ ۱۲۱۹ھ ہے۔

ڈاکٹر اسپرنگر کا یہ بیان صحیح ہے کہ قاسم کا تذکرہ سرور کے تذکرے (عمدۂ منتخبہ) پر مبنی ہے۔ اس کی شہادت خود سرور کے تذکرے میں موجود ہے۔ وہ قاسم کے حال میں لکھتے ہیں۔

---

[1] ختم اللہ بالحسنی فی خامس محرم الحرام المنتظم فی ہام ستہ و ستین و مائۃ بعد الالف من الہجرۃ المبارکۃ النبویۃ۔

در ینولا کہ سنہ ۱۲۱۹ ہجریست بہ سبب مغالطۂ این مجموعہ خود ہم ذوق تالیف نمودنِ تذکرہ پیدا کردہ ۔ چنانچہ از مؤلف مسودہ را گرفتہ انتخاب اشعار نمودہ تذکرۂ تالیف کردہ است۔"

اِس کا ثبوت ان دونوں تذکروں کے مطالعہ سے بھی ملتا ہے۔ متعدد شعرا کے حالات خفیف لفظی تغیر کے ساتھ بالکل وہی ہیں جو سرور کے تذکرے میں پائے جاتے ہیں اور منتخب اشعار بھی اکثر وہی ہیں ۔ خود قاسم نے بھی تذکرہ سرور کا دو ایک جگہ حوالہ دیا ہے[1]۔ علاوہ اس کے وہ تذکرۂ میر، تذکرۂ مصحفی اور تذکرۂ ذکا کا بھی حوالہ دیتا ہے۔ لیکن قائم، میر حسن، قدرت اللہ شوق کے تذکروں کا کہیں نام نہیں لیا اور سب سے زیادہ حیرت کی بات یہ ہے کہ وہ اپنے پیر و مرشد میر فتح علی الحسینی الگردیزی کے تذکرے کا مطلق ذکر نہیں کرتا حالانکہ وہ اپنی دوسری تصانیف میں ان کا ذکر بڑی عقیدت و احترام کے ساتھ کرتا ہے۔

فاضل مرتب نے یہ بالکل صحیح لکھا ہے کہ "یہ تذکرہ مولانا محمد حسین آزاد کی مشہور تالیف آبِ حیات کا ایک اہم ماخذ ہے"۔ اور اس لیے اس زمانے میں جو بعض غلطیاں یا غلط بیانیاں آزاد مرحوم سے منسوب کی گئی ہیں دراصل ان کا ملزم قاسم ہے۔ منجملہ اُن کے میر صاحب کی بد دماغی اور تنگ مزاجی کے متعلق آزاد نے نمک مرچ لگا کر ایک طومار لکھ مارا ہے

---

[1] صفحہ ۲۰۱ و ۲۹۵ (جلد اوّل)

جو مبالغہ اور غلو کی حد تک پہنچ گیا ہی۔ اس کے اصل فقرے قاسم کی عبارت کے لفظ بلفظ ترجمے ہیں۔ خصوصًا ولی کی نسبت یہ فقرہ کہ "ولی شاعریست از شیطان مشہور تر" جو سراسر میر صاحب پر اتہام ہی اسی تذکرے سے نقل کیا گیا ہی۔ میر خان کمترین کا یہ مصرع "ولی پر جو سخن لائے اسے شیطان کہتے ہیں" کوئی قطعی ثبوت نہیں۔ قاسم خود اس امر کے مقر ہیں کہ یہ (کمترین) ہر شخص کی نسبت کچھ نہ کچھ لکھ ڈالتا تھا اور ایک عامی وضع شخص تھا۔ بات یہ ہی کہ بعض اشخاص جو اپنے زعم میں اپنے آپ کو بڑا شاعر سمجھتے تھے اور میر صاحب سے داد کے طالب ہوتے تھے وہ انھیں مُنہ نہیں لگاتے تھے۔ یہ اپنے دل کا بخار اس طرح نکالتے تھے۔ غالبًا قاسم کا شمار بھی اسی قسم کے شعرا میں تھا۔ چنانچہ اس کے ضخیم کلیات سے جو مختلف اصناف سخن پر مشتمل ہی ظاہر ہی کہ اگرچہ وہ مشاق شاعر ہی مگر کلام لطف سے خالی ہی۔ میر صاحب کا تذکرہ نکات الشعرا انجمن ترقی اردو نے مدت ہوئی شائع کر دیا ہی۔ وہ قلمی نسخہ جس پر مطبوعہ نسخہ مبنی ہی اب تک میرے پاس موجود ہی۔ یہ سید عبدالولی عزلت کا نسخہ ہی جو میر صاحب کے خاص دوستوں میں سے تھے۔ نسخہ بہت صاف اور خوش خط لکھا ہوا ہی اور عزلت نے اپنے لیے نقل کروایا تھا۔ اس کا سنہ کتابت ۱۱۷۲ھ (یعنے تالیف تذکرہ کے سات سال بعد) ہی۔ اس میں ولی کی نسبت صاف

لکھا ہی "از کمال شہرت احتیاج تعریف ندارد"[1] ایسا معلوم ہوتا ہی کہ کسی بدطینت مخالف نے "مشہور تر از شیطان" کی اڑا دی، چلتا ہوا فقرہ تھا، عام و خاص میں مشہور ہو گیا۔

بعض حضرات نے جو یہ قیاس قایم کیا ہی کہ ممکن ہی کہ پہلے ہو اور بعد میں یہ فقرہ خارج کر دیا گیا ہو، کسی طرح قابل قبول نہیں۔ میر صاحب اس مزاج کے آدمی نہ تھے کہ وہ کسی کے کہنے سننے یا مخالفت سے اپنی رائے بدل دیتے یا اپنے تذکرے میں سے کوئی عبارت خارج کر دیتے۔ ایک شہادت اور میں اپنی تائید میں پیش کرتا ہوں۔ شفیق نے اپنے تذکرۂ چمنستان شعرا میں میر صاحب کے حق میں بہت زہر اُگلا ہی اور دل کھول کر ان کی مذمت کی ہی اور نکات الشعرا میں جہاں کوئی ذراسی بھی بات مل گئی ہی تو اس نے بات کا بتنگڑا بنا دیا ہی۔ میر صاحب کا تذکرہ اس کے پیش نظر تھا۔ جا بجا اس کا ذکر ہی۔ اگر اس میں ولی کی نسبت یہ فقرہ ہوتا تو وہ کبھی درگزر نہ کرتا۔ درگزر کرتا۔ کیا معنی ایک آفت برپا کر دیتا۔ میرا یہ یقین ہی کہ یہ میر صاحب پر اتہام ہی اور اس کا الزام قاسم کے سر ہی۔

پروفیسر شیرانی تحریر فرماتے ہیں "حکیم صاحب میر صاحب (میر تقی میر) سے بھی خفا ہیں۔ خفگی کے اسباب سے ہم تاریکی میں ہیں"۔ ناراضی کی

---

[1] نکات الشعرا صفحہ ۹۴۔

اصل وجہ یہ ہی کہ حکیم صاحب کے پیر و مرشد سید فتح علی گردیزی میر صاحب سے کسی وجہ سے ناراض تھے جس کی تفصیل کا یہ موقع نہیں۔اس کے متعلق میں اپنی رائے تذکرۂ گردیزی کے دیباچے میں لکھ چکا ہوں۔یہ خفگی ان کے تذکرے سے صاف ظاہر ہی۔ میر صاحب کے ذکر میں صرف ایک سطر ہی اور انتخاب کلام میں صرف ایک شعر حالانکہ معمولی معمولی شعرا کے کلام سے کئی کئی شعر اور بعض کے کلام سے کئی کئی صفحے نقل کیے ہیں۔ مرشد کی ناراضی سے مرید بھی ناراض ہی اور جو کام مرشد سے نہ ہو سکا وہ مرید نے کر ڈالا۔

دوسرا بہتان قاسم نے میر صاحب پر یہ باندھا ہی کہ باوجودیکہ خان آرزو کے شاگرد ہیں مگر بوجہ نخوت و غرور اس سے بالکل منکر ہیں۔ اوّل تو میر صاحب کو خان آرزو سے تلمذ نہیں، ذکر میر میں انھوں نے اپنی تعلیم اور شعر گوئی کے متعلق صاف صاف لکھ دیا ہی۔ دوسرے نکات الشعرا میں جتنی تعریف خان آرزو کی کی ہی شاید کسی دوسرے کی کی ہو۔ ان کے علم و فضل و کمال کی تعریف کرنے کے بعد لکھتے ہیں "حاصل کمالات اوشاں از حیّز بیان بیرونست۔ ہمہ اوستادان مضبوط فن ریختہ ہم شاگردان آن بزرگوارند"۔ یہ باتیں آزاد کے کام کی تھیں، انھوں نے اپنے دلکش انداز میں اس طرح لکھا کہ عام طور پر مشہور ہو گئیں۔ بہرحال یہ تذکرہ بہت قابل قدر ہی، اس میں اکثر ایسے شعرا کا

ذکر آتا ہے جن سے مؤلف بذات خود واقف تھا اور ان کے حالات جہاں
اس کو معلوم ہوسکے بے کم و کاست لکھ دیے ہیں، اسی ضمن میں بعض پُرلطف
لطیفے اور حکایتیں بھی آگئی ہیں جو اُس زمانے کی معاشرت، شعرگوئی
مشاعروں اور حالات پر روشنی ڈالتی ہیں۔ سوائے دو چار کے ہر ایک
حالات قلم بند کرنے میں انصاف اور راست بازی سے کام لیا ہے۔ ہر ایک
کے کلام کی تعریف میں کچھ نہ کچھ ضرور لکھتے ہیں۔ اگرچہ اس عام تعریف سے
اُن کے ذوقِ سخن کی طرف سے تھوڑی سی بدگمانی پیدا ہوتی ہے لیکن جہاں
ضرورت ہوتی ہے وہاں پتے کی بات بھی کہہ جاتے ہیں اور معقولیت کے سا
تنقید کا حق ادا کر دیتے ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ مشاق صاحبِ فن ہو
کے علاوہ صاحبِ ذوق بھی تھے۔

فاضل مرتب نے علاوہ دیباچے کے جس میں قلمی نسخوں کی کیفیت، مؤلف
کے حالات، تذکرے کی تنقید وغیرہ ہے، کتاب کے آخر میں دو فہرستیں بھی
شامل کر دی ہیں۔ ایک اسمائے اشخاص کی اور دوسری کتب و مقامات و دیگر
اُمور کی۔ اسی کے ساتھ علیحدہ اُن اغلاط کی بھی تصحیح کر دی ہے جو مؤلف تذکرہ سے
اثنا قیہ سرزد ہو گئی ہیں۔ دیباچے کے شروع میں ایسے الفاظ کی فہرست بھی
(بقیہ صفحہ) دے دی ہے جو مؤلف کے زمانے میں مختلف طریقے پر لکھے جاتے تھے۔

غرض کہ قابل مرتب کی محنت و کاوش اور حسن ترتیب ہر لحاظ سے
قابل داد ہے اور اس میں شبہ نہیں کہ اس تذکرے کی اشاعت سے اُردو زبان
کی تحقیق و تاریخ میں جس کا شوق اس زمانے میں پیدا ہو چلا ہے، بیش بہا
مدد ملے گی۔